مشکوۃ و دورۂ حدیث کے طلبہ کے لیے انمول، بیش بہا تحفہ

مبادیات حدیث

علی نہج مقدمة مشکوة المصابیح

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

سابق صدر مفتی و حال شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ترتیب جدید، تحقیق و حواشی

مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوری

ترتیب و اضافہ

مفتی محمود صاحب بارڈولی

ناشر

مکتبۂ انور، محمود نگر، ڈابھیل

تفصیلات

نام کتاب : مبادیاتِ حدیث

مؤلف : حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب

مرتب : مولانا مفتی محمود بارڈولی صاحب

تحقیق وحواشی : مولانا مرغوب احمد لاجپوری صاحب (ڈیوزبری)

ضخامت : ۲۲۴

سن اشاعتِ اول : ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۹۹۵ء

سن اشاعتِ ثانی : ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۰۰۶ء

سن اشاعتِ ثالث : ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰۱۶ء

ملنے کا پتہ

IDARA TUS SIDEEQ
Dabhel, Dist, NAVSARI, GUJARAT, INDIA
Pin Code:396415, Cell:+91-9913319190

MAKT ABA-A-ANWER
Mahmood Nagar, Near Jamia Islamia Dabhel
Dist. NAVSARI, GUJARAT, Pin Code:396415
Cell:+91-99246934 70

فہرست مبادیات حدیث

دوسرا باب: انواع کتب حدیث

تیسرا باب: طبقات کتب حدیث

چوتھا باب: تقسیم حدیث

پانچواں باب: مقدمۃ الکتاب

چھٹا باب: ستره ائمہ حدیث

ساتواں باب

فوائد اسناد، طالبین سے گزارش

عرضِ ناشر

از: عبدالقیوم راجکوٹی

مشکوۃ کی خصوصیت:

احادیثِ نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کا ایک مجموعہ جو صدیوں پہلے ''مشکوۃ المصابیح'' کے نام سے مدوّن و مرتب ہوا تھا، آج بھی اس کی تازگی و شادابی میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

''حدیث نبوی'' ایک متبرک فن ہے، اس کی نسبت ایک ایسی زندۂ جاوید شخصیت کی طرف ہے کہ جب تک اس روئے زمین میں نوعِ انسان موجود ہے اور اس میں زندگی کا اثر اور شعور و احساس کا نشو و نما پایا جاتا ہے، اس وقت تک یہ فنِ حدیث اسی تازگی و شادابی کے ساتھ لہلہاتا رہے گا۔ جیسا کہ قارئین بخوبی جانتے ہیں کہ احادیث کے باب میں مصنفات اور کتابوں کی ترتیب میں ہر مؤلف و محدث کا نقطۂ نظر منفرد ہوتا ہے، مثلاً: امام بخاری محمد بن اسماعیلؒ (م

۲۵۶ھ) اپنی کتاب ''بخاری'' میں احادیث کی روایت میں اپنی قوتِ فکر ونظر کا مجتہدانہ مظاہرہ کرتے ہیں، اور امام مسلم ابن الحجاج قشیری (م ۲۶۱ھ) اپنی کتاب ''صحیح مسلم'' میں احادیث کی نقل وبیان میں ایک حدیث کی متعدد سندوں کو جمع کردیتے ہیں، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (م ۲۷۵ھ) اپنی کتاب ''سنن ابی داؤد'' میں ایک ہی باب سے متعلق تمام احادیث جمع کردیتے ہیں، اسی طرح دیگر کتبِ حدیث میں سے ہر ایک کی ایک امتیازی شان ہے اور ہر ایک کی کچھ خصوصیات اور فوائد ہیں۔

البتہ احادیث کا جو گلدستہ ''مشکوۃ المصابیح'' کے نام سے ہمارے سامنے موجود ہے، اس کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس میں صحاحِ ستہ کے علاوہ دیگر کتبِ احادیث مثلاً: شعب الایمان بیہقی، مسند احمد، مسند رزین وغیرہ کی احادیث وافر مقدار میں موجود ہیں۔

''مشکوۃ المصابیح'' میں ایک خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ اس میں ان احادیث کی روایت کا التزام نہیں کیا گیا کہ جن کے سمجھنے میں قاری کو دشواری اور مشکلات کا سامنا ہو؛ بلکہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ''مشکوۃ المصابیح'' کو ابتدائی تعارف یا ایک عام مسلمان کے لیے احادیثِ نبویہ سے علمی وعملی تعلق وربط پیدا کرنے کے لیے منصۂ شہود پر لایا گیا تھا، چنانچہ آج بھی مدارسِ اسلامیہ میں اس کو صحاحِ ستہ سے پہلے پڑھایا جاتا ہے، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ تعارف کا اول مرحلہ ایسی کتاب کے ذریعہ ہو کہ جس میں نہ اتنا طول ہو کہ صرف منتہی طلبہ ہی اس سے استفادہ کرسکیں، اور نہ اتنا اختصار ہو کہ جس سے عام قاری بدکنے لگے۔

صوفیا میں مشکوۃ کا مقام

دوسری طرف یہ بات ہے کہ اگر صحیح بخاری کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ مصائب ومشکلات میں اس کا ختم کرایا جاتا ہے تو ''مشکوۃ شریف'' کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ صوفیا کے حلقہ میں زیرِ درس رہی ہے، صوفیائے کرام نے حدیث کے اس مجموعہ کو اذکار و وظائف سے معمور زندگی میں اس وجہ سے مقدم رکھا کہ یہ کتاب فنِ حدیث کی دیگر کتابوں کی طرح اطناب و ایجاز پر مشتمل نہیں ہے۔

ماضی قریب میں شمالی ہند میں آزادی کی جدوجہد کرنے والے جن کی قیادت حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی قدّس سرّہ (م ۱۲۴۶ھ) فرما رہے تھے، ان کا اپنے مجاہدین کے سلسلے میں یہ طریقۂ کار رہا کہ ''مشکوۃ شریف'' کے درس وتدریس کا التزام تھا، درس کی ذمہ داری حضرت شاہ اسماعیل شہید علیہ الرحمہ (م ۱۲۴۶ھ) انجام دیتے تھے؛ البتہ اسرار و رموز اور نکات و حِکَم حضرت سید احمد بریلویؒ بیان فرماتے تھے۔

حجۃ اللہ البالغہ مشکوۃ کی شرح

حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دہلوی قدس سرہ (م ۱۱۷۴ھ) کی معرکۃ الآرا تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' - جو علومِ اسرارِ الٰہیہ اور حِکماتِ شرعیہ کے موضوع پر مشتمل ہے - مثالی کتاب ہے، اس کے متعلق صاحب النظر علما کی یہ رائے ہے کہ وہ درحقیقت ''مشکوۃ شریف'' کی شرح ہے، جو حضرات کتاب کی ظاہری ترتیب سے ہٹ کر تخریجِ احادیث پر عمیق نظر رکھتے ہیں وہ اس بات سے بخوبی

واقف ہیں کہ شاہ صاحب عموماً ''مشکوۃ شریف'' کی احادیث کو پیشِ نظر رکھ کر امتِ مسلمہ کے سامنے اپنے قیمتی جواہر پیش کرتے ہیں۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ (م ۱۳۷۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''جس طرح ہندوستان میں بخاری کی متعدد شروح مختلف علما کے قلم سے پائی جاتی ہیں، مشکوۃ کے حواشی و شروح کی تعداد تو ان سے کہیں زیادہ ہے، آخر میں دنیائے اسلام کی وہ نادر و بے مثال کتاب جس کا نام ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے، بظاہر وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کوئی مستقل کتاب معلوم ہوتی ہے؛ لیکن اپنے تجربہ و تتبع کی بنیاد پر میرا یہ خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے مشکوۃ ہی کو سامنے رکھ کر ہر باب کی حدیثوں کو مجموعی نقطۂ نظر سے کچھ اس طرح مرتب فرمایا ہے کہ اسلام ایک فلسفہ کی شکل میں بدل گیا ہے، ایسا فلسفہ جس کی طرف نہ رہنمائی پہلوں کو میسر آئی اور نہ پچھلوں کو؛ اسی لیے میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کو عموماً مشکوۃ ہی کی ایک خاص شرح قرار دیتا ہوں''۔(۱)

بابا مشکوٰتی

ہندوستان میں ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ لوگ قرآن شریف کی طرح ''مشکوۃ شریف'' کو سینوں میں محفوظ رکھتے تھے، مرد تو مرد عورتوں میں بھی مشکوۃ سے دل چسپی و لگاؤ کا خاص ذوق پایا جاتا تھا۔

علمائے ہند میں ایک شخص ''بابا داؤد مشکوٰتی'' کے نام سے مشہور تھے، جو

(۱) (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت: ۱/ ۲۰۱)

مشکوۃ شریف کے متن وسند کے حافظ تھے، اسی وجہ سے ان کو ''بابا مشکوٰتی'' کا لقب دیا گیا تھا۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''ان ہی دنوں میں جب کہا جاتا ہے کہ ہندوستان فنِ حدیث سے بیگانہ تھا، صحاحِ ستہ کا وہ ضخیم مجموعہ جس میں صحاح کے سوا حدیث کی دوسری کتابوں کی حدیثیں بھی جمع ہیں، زبانی یاد کرنے والے لوگ موجود تھے، ''تذکرۂ علمائے ہند'' میں بابا داؤد مشکوٰتی کے ذکر میں ہے:

درفقہ وحدیث وتفسیر وحکمت ومعانی ید طولیٰ داشت، وحافظ مشکوۃ المصابیح بود، بدیں وجہ اورا مشکوٰتی می گفتند۔ (ص:۶۰)

فقہ، حدیث، تفسیر اور حکمت ومعانی میں کمال رکھتے تھے، اور مشکوۃ شریف کے حافظ تھے، اسی وجہ سے ان کا لقب مشکوٰتی ہو گیا تھا۔ (۱)

عورتوں کا مشکوۃ سے لگاؤ

حکیم الامت حضرت تھانویؒ (م ۱۳۶۲ھ) فرماتے ہیں:

قصبۂ کاندھلہ کی اکثر عورتیں ''مشکوۃ'' اور ''درِّ مختار'' تک پڑھی ہوئی ہیں، اور بہت کم عورتیں ہیں جو حافظہ نہ ہوں اور رمضان میں تمام رات سوتی ہوں۔ (۲)

''جامعہ اصلاح البنات سملک وڈابھیل''، ضلع: نوساری، گجرات، کی سنگِ

---

(۱) (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت: ۱/ ۱۹۵)

(۲) (مجالسِ حکیم الامت ص: ۱۴۷)

بنیاد (۱۹۷۴ء) کے موقع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (م ۱۴۰۳ھ) ''نے تعلیمِ نسواں کی اہمیت وافادیت کے'' موضوع پر اپنے ایک خطاب میں فرمایا تھا: ایک عورت جو کہ رشتہ میں ہماری نانی ہوتی تھیں، مشکوۃ تک پڑھی ہوئی تھیں، بہت متقی اور پرہیز گار تھیں، شادی بیاہ میں جہاں بھی جاتی مشکوۃ شریف ان کی بغل میں دبی ہوتی تھی، بیٹھتے ہی وہاں ابتدائی رسمی بات چیت عورتوں سے ہوتی اور اس کے بعد مشکوۃ شریف کھول کر جو حدیث پہلے سامنے آتی اس پر وعظ کہنا شروع کر دیتیں۔ (۱)

عملی مشکوۃ

علم کے حصول کا مقصودِ اصلی عمل ہے، مدارسِ دینیہ میں ایک وہ وقت تھا کہ حضراتِ اساتذۂ کرام دورانِ درس طلبائے علوم کو علم پڑھانے کے ساتھ ساتھ عملی مشق کرواتے، علم پر عمل کا یہی صحیح طریقہ اور وقت ہے کہ جن شخصیتوں سے صحیح علم لیا جائے، عملِ صحیح کا طریقہ اور کیفیت ان ہی سے معلوم ہو سکتی ہے، رفتہ رفتہ یہ طریقہ مدارس میں کم ہو رہا ہے۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ مشکوۃ پڑھنے کے سال کا اپنا واقعہ بیان فرماتے ہیں:

''میں نے مشکوۃ شریف حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، ایک طرف تو آپ احادیث کا ترجمہ کراتے تھے، اور دوسری طرف آپ رکوع اور سجدہ کر کے کیفیت بھی بتلاتے تھے، میں نے عرض کی حضرت! اس کی کیا ضرورت ہے، یہ تو مجھے معلوم ہے، آپ نے فرمایا کہ اسی لیے تو معلوم ہے کہ

(۱) (ماہنامہ دوائے دل، ترکیسر، شوال المکرم ۱۴۳۶ھ)

کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ پھر فرمایا کہ میں نے حضرت گنگوہیؒ سے مشکوۃ شریف پڑھی، تو آپ نے بھی رکوع اور سجدہ کی کیفیت عمل کے ساتھ بتلائی، میں نے عرض کیا، حضرت اس کی کیا ضرورت ہے، یہ تو مجھے معلوم ہے، آپ نے فرمایا کہ اسی وجہ سے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔

اور حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ میں نے مشکوۃ شریف حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے پڑھی، انھوں نے بھی اسی ہیئت سے رکوع اور سجدہ بتایا، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو مجھے معلوم ہے، آپ نے فرمایا کہ اسی لیے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ ایسے ہی شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے شاہ محمد اسحق صاحبؒ سے، انھوں نے شاہ عبدالعزیزؒ سے، انھوں نے شاہ ولی اللہؒ سے، انھوں نے شیخ ابو طاہر مدنیؒ سے نقل کیا ہے اور ان سے اسی ہیئت کی سند رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

مشکوۃ شریف میں ایک حدیث ہے: زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا کہ اگر کوئی مرجاتا تو چھ چھ مہینے تک رونے کی وصیت کرتے، اور رونے والی عورتیں نہ ہوتیں تو کرایہ پر رونے والی لی جاتیں، جو چھ مہینے تک روتیں؛ تاکہ لوگ یہ خیال کریں کہ مرنے والا بہت بڑا آدمی ہے جس پر چھ ماہ تک ماتم ہوتا رہا۔ جب میں نے یہ حدیث پڑھی تو حضرت والد صاحب نے رونے کی ہیئت بنا کر مجھے بتایا، پھر فرمایا کہ شاید تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن حضرت گنگوہیؒ نے یہی ہیئت بتلائی تھی، اور فرمایا تھا کہ شاید تم کو یہ خیال ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ حضرت مولانا شاہ عبدالغنیؒ نے مجھے ایسے ہی ہیئت بتلائی تھی، یہاں تک کہ یہ سلسلہ ایسے ہی حضرت عبداللہ ابن عمر

رضی اللہ عنہما تک پہنچتا ہے۔(۱)

حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام (اسمائے حسنیٰ) یاد کرنے پر دخولِ جنت کی بشارت وارد ہوئی ہے۔

جامعہ ڈابھیل کے استادِ حدیث حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی (م ۱۳۸۵ھ) ''مشکوۃ شریف'' کے طلبہ کو ''اسمائے حسنیٰ'' زبانی یاد کرانے کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔

جامعہ ہٰذا کے سابق مہتمم حضرت مولانا محمد سعید بزرگ سملکیؒ (م ۱۴۱۱ھ) نے مشکوۃ شریف حضرت مولانا سے پڑھی، وہ اپنے مشکوۃ کے سال کا حال بیان فرماتے ہیں: ہماری پوری جماعت کو استاد محترم حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ نے مشکوۃ کا درس موقوف کر کے ''اسمائے حسنیٰ'' یاد کروائے تھے اور ہر ایک سے سنے تھے، آج تک مجھے ''اسمائے حسنیٰ'' یاد ہیں اور روزانہ پڑھنے کا معمول ہے۔(۲)

درسخن مخفی منم

درسخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد درسخن بیند مرا

ترجمہ: میں اپنے کلام میں اس طرح چھپا ہوا ہوں جس طرح گلاب کی پنکھڑیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہے، جو دیکھنے کی خواہش رکھتا ہو وہ میرے کلام

(۱) (خطباتِ حکیم الاسلام: ۲/ ۲۸۱، ۲۸۲)
(۲) (نقوشِ بزرگاں: ۲/ ۱۹۴)

میں مجھے دیکھ لے۔

ہر کلام متکلم کی صفات اور اثرات اپنے اندر لیے ہوئے ہوتا ہے، تکرارِ کلام کی وجہ سے متکلم سے مناسبت پیدا ہوجانا یقینی امر ہے؛ نیز ہر مصنف کا قاعدہ ہے کہ جو کوئی شخص اس کی مؤلفہ کتاب کا اہتمام سے مطالعہ کرتا ہے تو فطرتاً اس کی طرف التفات اور توجہ ہوا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جو شخص کثرت سے کلام اللہ کی تلاوت کرتا ہے وہ حق سبحانہ وتقدس کی زیادتیٔ توجہ کا مورد بن جاتا ہے، یہی حال احادیثِ نبویہ کا ہے کہ حدیث شریف کی مزاولت سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توجہ ورِد رکھنے والے کی طرف منعطف ہوجاتی ہے، اور کبھی اسی توجہ کے ثمرہ کے طور پر خواب میں حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دولتِ زیارت میسر ہوجایا کرتی ہے۔

مشکوۃ شریف کی مناسبت سے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارتِ مبارکہ کے دو واقعے نقل کیے جاتے ہیں۔ غور کرنے کا مقام ہے؛ مدارسِ دینیہ کے طلبہ اُس وقت روحانیت کے کس اعلیٰ مقام پر فائز ہوں گے! اور آج کے پُرآشوب دور میں ہم بھی ان ہی مدارس سے نسبت رکھتے ہیں، مگر ہمارا کیا حال ہے! ع

ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بکجا

حسبِ ذیل دونوں واقعے اسی جامعہ ڈابھیل کی شخصیات سے متعلق ہیں:

پہلا واقعہ

امامِ ربّانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ) کے مریدِ باصفا، حضرت شیخ الہند (م ۱۳۳۹ھ) کے تلمیذِ رشید وخادم، شیخ الاسلام حضرت مدنی (م ۱۳۷۷ھ) کے مجاز، جامعہ ڈابھیل کے سابق مہتمم حضرت مولانا احمد بزرگ

سملکیؒ (۱۳۰۷ھ) کا ہے۔

مشکوۃ پڑھنے کے زمانے میں روزانہ زیارت

۱۴۱۸ھ کا رمضان المبارک حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (م۱۴۱۷ھ) کے خادمِ خاص حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈور افریقی مدظلہ خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ (م۱۴۰۲ھ) نے جامعہ ڈابھیل کی مسجد میں گزارا، عجیب روحانی ماحول تھا، اس وقت علما وفضلا وارد ہوتے تھے، حضرت مولانا ابراہیم صاحب مدظلہ ان سے وعظ کہلواتے۔

ان ہی میں سے ایک مولانا محمد سلمان صاحب گنگوہی زید مجدہ ہیں، موصوف نے اپنی تقریر کے دوران مولانا احمد بزرگ کا قصہ بیان فرمایا، بعد میں احقر نے ان سے تحریری طور پر نقل کی درخواست کی، موصوف نے جو تحریر عنایت فرمائی اس کو بلفظہ موصوف کے شکریہ کے ساتھ نقل کرتا ہوں:

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

حضرت مولانا حکیم عبد الرشید محمود عرف ننو میاں (م۱۴۱۵ھ)، نبیرۂ حضرت اقدس گنگوہیؒ نے بیان فرمایا کہ ''جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل'' ضلع: بلساڑ، کے مہتمم حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب (اوّل) دار العلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے، اس وقت جو گجراتی طلبہ دار العلوم میں مشکوۃ شریف پڑھتے تھے ان سے

دریافت کیا کہ تم لوگ مشکوۃ شریف حدیث کی کتاب پڑھ رہے ہو، کتنی مرتبہ تم لوگوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواب میں زیارت کی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ایک مرتبہ بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ: تم لوگ کیا مشکوۃ پڑھتے ہو؟ میں نے جب مشکوۃ شریف شروع کی تھی اسی دن سے روزانہ خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوتی تھی۔ اپنے اندر حدیث شریف پڑھنے کے ساتھ عشقِ نبی پیدا کرو۔ فقط انتہی بلفظہ۔

محمد سلمان گنگوہی عفی عنہ

۱۴۱۸/۹/۲۴

دوسرا واقعہ

جامعہ ڈابھیل کے فاضل مولانا محمد اسعد اللہ ایرانی ثم کولھا پوری کا ہے، موصوف نے ۱۴۰۳ھ میں جامعہ ڈابھیل سے فراغت حاصل کی، کولھا پور کے قرب وجوار میں ان کی بڑی خدمات ہیں، ان کا اصلاحی تعلق اپنے والدِ بزرگوار حضرت مولانا عبد الصمد ایرانی (م ۱۴۰۹ھ، فاضل جامعہ ہذا) سے رہا، سلوک ومعرفت کی منزلیں طے کرتے رہے، والد صاحب نے اجازت وخلافت سے نوازا، ۱۴۰۹ھ میں والدِ ماجد کا وصال ہو گیا، پھر مرشد العلما حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کی طرف رجوع کیا، حضرت نے بھی اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا، مولانا محمد اسعد اللہ کا چار سال پہلے

سنیے، اپنی طالب علمی کا حال ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

زیارت ہو تو ہی آگے پڑھنا

جب میں عربی ششم کے سال گھر سے روانہ ہونے لگا تو والد ماجد نے مجھ سے خطاب کرکے فرمایا کہ: اسعد اللہ! اگر ششم کے سال میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تو ہی آگے پڑھنا؛ ورنہ سیدھے بوریا بستر لپیٹ کر گھر چلے آنا، اگر ششم میں پہنچ کر بھی طالبِ علم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے مشرف نہ ہو تو آگے پڑھ کر کچھ فائدہ ہی نہیں۔ پھر آگے آپ نے فرمایا: چنانچہ میں ''جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل'' پہنچا تو پہلے ہی دن مشکوۃ شریف کی پہلی حدیث (انما الاعمال بالنیات) کا اچھی طرح مطالعہ کیا، پھر جب رات میں محوِ خواب ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم ہیں، میں جلدی سے آگے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک کا بوسہ لینے لگا، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا، میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ وابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے (جو اس حدیث کے راوی ہیں) دریافت کیا، کیا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت نقل فرمائی ہے؟ انہوں نے جواباً فرمایا: ہاں، پھر خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبانِ خوش بیاں وگوہر فشاں سے مکمل حدیث سنائی اور فرمایا کہ: یہ میرا ہی فرمان ہے۔ حضرت مولانا نے پورا واقعہ سنانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ: یہ تو پہلے دن کا واقعہ ہے، پورے سال میں نہ جانے کتنی مرتبہ پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ (۱)

(۱) (تذکرۂ مولانا اسعد اللہ ص: ۶ غیر مطبوعہ)

کتاب کے بارے میں

جامعہ ڈابھیل میں ۱۳۹۴ھ میں پہلی مرتبہ حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کو مشکوٰۃ شریف کی تدریس سپرد کی گئی، اس وقت ''مقدمۂ علم حدیث'' اور ''مقدمۂ مشکوٰۃ شریف'' کے طور پر طلبا کو چند اہم اور ضروری امور نوٹ کرائے تھے، ۱۳۹۴ھ تا ۱۳۹۷ھ یعنی چار سال یہ سلسلہ جاری رہا، بعد میں ''مبادیاتِ حدیث'' کے نام سے یہ مجموعہ منصۂ شہود پر آیا، یہ کتاب متعدد بار طبع ہوئی۔

پہلی مرتبہ ۱۴۱۶ھ م ۱۹۹۵ء میں ''زمزم بکڈپو دیوبند'' سے حواشی اور تحقیق کے بغیر طبع کی گئی۔

دوسری مرتبہ ۱۴۲۷ھ م ۲۰۰۶ء میں ''جامعۃ القراءات کفلیۃ'' سے حواشی اور تحقیق کے ساتھ چھپی۔

دونوں طباعت کا فرق اور دوسری مرتبہ طباعت کی ضرورت کی تفصیل ''پیش لفظ'' از حضرت اقدس مفتی صاحب مدظلہ اور ''عرضِ محشی'' از رفیقِ محترم مولانا مرغوب احمد صاحب زیدمجدہم میں لکھی ہے، ملاحظہ کرلیں۔

نیز یہ کتاب ''مکتبۂ بیت العلم کراچی'' سے بھی ''مبادیاتِ حدیث'' کے نام سے طبع ہوئی ہے، بندہ نے سالِ گذشتہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ کی اجازت سے طبع کرنا چاہا تو حضرت نے بخوشی اجازت مرحمت فرمادی۔ اس کے بعد ناشرِ ثانی، جامعۃ القراءات کفلیۃ کے مہتمم حضرت قاری اسماعیل بسم اللہ

صاحب زید مجدہم سے استاذِ محترم حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم کی وساطت سے طباعت کی اجازت طلب کی، انہوں نے بھی بخوشی اجازت عنایت فرمادی۔ مفتی رشید احمد لاجپوری زید مجدہم کی وساطت سے کتاب کے محشی مولانا مرغوب احمد صاحب زید فضلہ کی طرف سے حواشی میں اضافہ کی اجازت میسر آئی۔ لہذا بندہ ان تمام حضرات کا شکر گزار ہے، اللہ تعالیٰ میرے ان تمام بزرگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور حالیہ طباعت کے ثواب میں ان کو برابر کا شریک کردے، آمین یارب العالمین۔

ابتداءً تو یہ ارادہ تھا کہ کتاب بعینہ طبع کردی جائے؛ اس لیے کہ کتاب کے محشی مولانا مرغوب احمد صاحب زید فضلہ نے کتاب کے مضامین کے ہر جز کو مستند اور باحوالہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، نہایت ہی عرق ریزی سے ذمہ دارانہ کام کیا ہے۔ فجز اھم اللہ تعالیٰ عن جمیع اھل العلم۔ آمین۔

مگر طباعت سے پہلے پروف دیکھنا شروع کیا تو رفتہ رفتہ معمولی محنت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی؛ نیز طباعت کی اغلاط بھی نظر آئیں؛ لہذا اس تیسری طباعت میں حسبِ ذیل امور کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے:

(۱) حتی الامکان رموزِ اوقاف واملا کی رعایت کردی گئی ہے۔

(۲) حسبِ ضرورت حاشیہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

(۳) عربی عبارتوں میں جہاں سقم محسوس ہوا وہاں مآخذ سے رجوع کر کے کتابتی غلطیوں کی اصلاح کی گئی ہے۔

(۴) ناقص حوالجات کی تکمیل کردی ہے؛ مگر ایسی جگہیں کم ہیں۔

(۵) بعض جگہوں میں آیاتِ قرآنیہ، اور عربی اشعار پر اعراب لگا کر ترجمہ

کردیا گیا ہے۔

(۶) اصل ترتیب باقی رکھتے ہوئے سہولت کے خاطر کتاب کو سات ابواب پر تقسیم کردیا ہے۔

(۷) کتاب کے اخیر میں ''مصادر و مراجع'' مع ''اسمائے مصنفین وسنینِ وفات'' حروفِ تہجی کی ترتیب پر ظاہر کردیے ہیں۔

(۸) بعض عناوین کا اضافہ کیا ہے۔

(۹) ''عرضِ ناشر'' میں ''مشکوۃ شریف'' کے ساتھ اہلِ علم کا اعتنا اور قلبی تعلق اور اس سلسلہ کے چند واقعات طالبانِ علومِ نبوت کی دل چسپی کے خاطر لکھ دیے ہیں۔

(۱۰) کتاب کے شروع میں مختصراً ''صاحبِ مبادیاتِ حدیث'' کا تعارف ہے۔

تعارف کی قطعاً ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ ''عیاں راچہ بیاں'' لیکن یہ ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ''مکتبۂ بیت العلوم کراچی'' سے مطبوعہ نسخہ میں سرِ ورق پر جلی حروف میں غلط نام تسامحاً چھپ گیا ہے۔ اس کی عبارت ہے:

مبادیاتِ حدیث

از افادات

حضرت مولانا مفتی احمد خان صاحب خانپوری مدظلہ

ملاحظہ کیجیے اس میں ''خان صاحب'' چھپا ہے، لفظ ''خان'' پٹھانوں کا لقب

ہے اور پٹھانوں کے نام کے اخیر میں یہ لفظ لکھا جاتا ہے، یہ غلط فہمی ''خانپور'' سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوئی ہے۔ الغرض بندہ نے حتی الامکان کتاب کی تصحیح وتزئین کی پوری کوشش کی ہے؛ تاہم اغلاط کے باقی رہنے کا امکان ضرور ہے، اگر کہیں حوالہ جات میں سقم وضعف یا اغلاط نظر آئیں تو از راہِ کرم ناشر کو ضرور مطلع فرمائیں، ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کردی جائے گی۔

کتاب کی تصحیح، حوالہ جات کی تخریج میں عزیز القدر مفتی معاذ صاحب بمبوی سلمہ اللہ تعالیٰ (استاذ جامعہ ڈابھیل) مفتی اویس صاحب گودھروی زید مجدہ (استاد جامعہ ڈابھیل) مولوی سلمان ایلولوی سلمہ اللہ تعالیٰ (متعلم دار الافتا والارشاد) کا وقیع تعاون حاصل ہوا؛ نیز ہمارے قدیم کرم فرما: مفتی محمد غیاث محی الدین زید مجدہم (مہتمم مدرسہ حفظ القرآن، کریم نگر، حیدرآباد) نے کتاب کا ظاہری حسن دوبالا کرنے اور طباعت کا مرحلہ پار کرنے میں انتھک مساعئ جمیلہ فرمائیں۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب ہی محسنوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور مزید خدماتِ علمیہ ودینیہ کے لیے موفق فرمائے؛ نیز اس حقیر کوشش کو شرفِ قبولیت بخشے، آمین۔

احقر عبد القیوم راجکوٹی

معین مفتی دار الافتا والارشاد

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات، ہند

۲۵/ ربیع الاول ۱۴۳۷ھ قبیل المغرب

صاحبِ مبادیاتِ حدیث

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری حفظہ اللہ تعالیٰ (سابق صدر مفتی وحال شیخ الحدیث ''جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل'' گجرات، ہند) کا شمار گجرات ہی نہیں؛ بلکہ پورے ہندوستان کے مؤقر علما میں ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے جانشین ہیں۔

آپ کی پیدائش ۲۷/ شوال المکرم ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۴/ ستمبر ۱۹۴۶ء بروز منگل رات دس بجے ہوئی، جائے پیدائش ''خانپور'' بستی ہے جو شہر جمبوسر (ضلع: بھروچ، گجرات، ہند) سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔

آں مخدوم دارالعلوم اشرفیہ راندیر سورت، گجرات، کے قدیم فاضل ہیں، دارالعلوم اشرفیہ، گجرات کی قدیم دینی درس گاہ ہے، آں مخدوم نے مذکورہ درس گاہ سے نظامِ درسی ۱۳۸۶ھ میں مکمل کیا، فراغت کے بعد ''ازہرِ ہند'' دارالعلوم

دیوبند میں دو سال مختلف فنون کی کتابیں پڑھیں اور افتا کا کورس مکمل کیا، آپ کے اساتذہ میں ہندوستان کے مشہور علما ہیں۔ مثلاً:

(۱) حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ (م ۱۴۰۳ھ)، مدیرِ دارالعلوم دیوبند۔

(۲) مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ (م ۱۴۱۵ھ)، استاذِ عربی ادب دارالعلوم دیوبند، وایڈیٹر "الداعی"۔

(۳) حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب دیوبندی (م ۱۴۳۱ھ) سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔

(۴) حضرت مولانا شریف حسن صاحب دیوبندی (م ۱۳۹۷ھ) سابق استاذ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔

(۵) حضرت مولانا محمد حسین بہاری صاحب (م ۱۴۱۲ھ) سابق استاذ دارالعلوم دیوبند۔

(۶) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔

(۷) حضرت مولانا مصلح الدین صاحب دامت برکاتہم، شیخ الحدیث ڈیوزبری تبلیغی مرکز انگلینڈ، یوکے۔

(۸) حضرت مولانا حکیم ابوالشفا حبیب الرحمن صاحب صدیقی بلیاویؒ (م ۱۴۱۰ھ) سابق استاذ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ راندیر۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (صاحبِ اوجز المسالک شرح موطأمالک) سے آپ کو ''احادیثِ مسلسلات'' کی اجازت حاصل ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ''جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات، ہند'' کو دینی خدمات کا مستقر بنایا، جامعہ ڈابھیل ۱۱۰ / سالہ قدیم ادارہ ہے۔

۱۳۸۸ھ سے ایں دم ۴۹ / سال سے جامعہ میں علومِ عربیہ، فقہ، حدیث اور فتاویٰ کی خدمات انجام دیں، مختلف فنون کی کتب کے علاوہ کتبِ احادیث میں مشکوۃ، ابوداؤد، ترمذی مع شمائل، موطأ مالک، ابنِ ماجہ، بخاری اول وثانی درساً پڑھائی، بخاری شریف ۱۴۰۵ھ سے تادمِ ایں، بتیس سال سے زیرِ درس ہے۔

سورت میں جاری ایک مجلس میں بیان کردہ ''ریاض الصالحین'' کی شرح جو ''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کے نام سے معروف ہے اور پندرہ جلدوں میں زیورِ طبع سے آراستہ ہے، یہ شرح آپ ہی کے افادات کا مجموعہ ہے۔

آپ ماہر وجید مفتی ہیں، ہزاروں فتاویٰ لکھے، جن میں اردو و گجراتی کے فتاویٰ کا اہم مجموعہ: گجراتی پانچ اور اردو چھ جلدوں میں بہ نام ''محمود الفتاویٰ'' زیورِ طبع سے آراستہ ہیں۔

ان فتاویٰ پر ممتاز علما نے اعتماد کیا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب پاکستانی دامت برکاتہم نے بھی تقریظ تحریر فرمائی ہے۔

ایک سو سے زائد طلبا نے آپ سے تدریبِ فتاویٰ حاصل کی، جو اس وقت

مختلف ممالک وجگہوں پر دارالافتا والارشاد میں خدمت انجام دے رہے ہیں، آپ کے شاگرد اس وقت دنیا کے مختلف ممالک مثلاً: سعودیہ، افریقہ، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، بارباڈوس، پنامہ، نیوزی لینڈ، فرانس، عرب امارت، کویت میں مؤقر مناصب کے ذریعہ دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمِ ظاہر کے ساتھ علمِ باطن سے بھی سرفراز فرمایا ہے، ایک طرف آپ شیخ الحدیث ہیں تو دوسری طرف آپ شیخِ طریقت بھی ہیں، جس طرح طبیب جسمانی بیماریوں کا علاج کرتا ہے اسی طرح آپ روحانی بیماریوں کا علاج فرماتے ہیں اور اس وقت بے شمار روحانی مریض آپ کے زیرِ علاج ہیں۔

آں مخدوم کو (۱) اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کی رکنیت۔
(۲) ازہر ہند، دارالعلوم دیوبند کی رکنیت۔
(۳) دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ کی رکنیت
(۴) آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کی میعادی رکنیت کا شرف بھی حاصل ہے۔

تفصیلی حالات کے لیے محمود الفتاویٰ اردو، جلد اول کا مقدمہ ص: ۵۳ تا ۲۸۶ کا مطالعہ کریں۔

پیش لفظ

از

حضرت الاستاذ مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً مسلماً:

پہلی مرتبہ جب مشکوۃ شریف کا درس احقر کے ذمہ ہوا اس وقت فنِ حدیث اور کتاب مشکوۃ سے متعلق ضروری اور اہم ابتدائی باتیں اپنی سہولت اور طلبہ کے افادہ کے لیے نوٹ کرلی تھیں۔

اُس زمانہ میں اردو زبان میں نصابی کتابوں کی شروحات کا اتنا رواج بھی نہیں تھا جو بعد میں ہوا، اس لیے اس قسم کی چیزیں کمیاب ہونے کی وجہ سے یہ تحریر طلبہ میں مقبول ہوئی، بہت سوں نے اس کو نقل کیا۔ اس کے بعد تو بحمد اللہ اردو زبان میں نصابی کتابوں اور درسی شروحات پر بہت کام ہوا اور اچھے اچھے شاہکار وجود میں آئے، جن کے سامنے میری اس تحریر کی کوئی حیثیت ووقعت نہیں تھی، پھر بھی محبت رکھنے والوں کا اصرار ہوا کہ آج کل جب اس طرح کی چیزیں طباعت کی شکل اختیار کر رہی ہیں آپ بھی اس کو چھپوالیں! لیکن میں ہمیشہ انکار کرتا رہا۔

بالآخر عزیز گرامی قدر مولانا مفتی محمود بارڈولی صاحب نے بہ اصرار وہ کاپی مجھ سے وصول کر ہی لی، اور اپنے طور پر اس کی طباعت کا انتظام کرلیا، جب وہ چھپ کر آئی اس کے ایک زمانہ بعد میری نظر سے گذری، میں نے جب دیکھا

تواس میں مختلف حیثیتوں سے نقص اور سقم محسوس ہوااور طباعت کی غلطیوں نے اس کو"ضِغْثٌ عَلیٰ اِبَالَۃٍ"[مصیبت بالائے مصیبت] کا مصداق بنادیا، پھر بھی محبت کرنے والے اس کو شوق ورغبت سے لیتے رہے، یہ ان کی محبت اور نکتہ نوازی کی بات تھی۔

ایک زمانہ کے بعد عزیزِ مکرم مولانا مرغوب احمد لاجپوری صاحب نے احقر کے سامنے اپنے ارادہ کا اظہار کیا کہ اگر اجازت ہوتو میں اس پر حاشیہ تحریر کروں، چنانچہ ان کے شوق اور ولولہ کو دیکھتے ہوئے اور اس لالچ میں کہ پہلی طباعت میں جو کمزوریاں رہ گئی ہیں وہ دور ہوجائیں ان کو اجازت دے دی، چنانچہ عزیزِ محترم نے چند ہی دنوں میں یہ کام مکمل کر کے مسودہ میرے پاس بھیج دیا؛ تاکہ نظرِ ثانی ہوجائے؛ لیکن میں اپنی کاہلی وسستی اور کچھ مصروفیات کی وجہ سے اس پر جلد نظرِ ثانی نہ کرسکا۔

ایک صاحب نے اپنے ایک مضمون کا مسودّہ برائے ملاحظہ ارسال فرمایا تھا، اس کو دیکھ رہا تھا، اس دوران مجھے یہ مسودہ یاد آ گیا اور اب تک اس پر نظرِ ثانی نہ کر کے عزیز موصوف کے ساتھ جو بے اعتنائی ہوئی اس پر ندامت کا احساس ہوا، چنانچہ دوسرے ہی روز مسودہ ہاتھ میں لے کر نظرِ ثانی کا کام مکمل کرلیا۔

عزیز موصوف نے احقر کے ساتھ محبت وتعلق کی بنیاد پر اس کتاب کے ساتھ جو اعتنا فرمایا اس پر دل سے ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں برکت فرما کر تالیف وتصنیف کی مقبول خدمات کے لیے ان کو بے انتہا قبول فرمائے، آمین۔

املاہ: العبد احمد خانپوری

۱۴/ ذی قعدہ ۱۴۲۴ھ

عرضِ محشی

از قلم: مولانا مرغوب احمد صاحب

حضرت الاستاذ مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کا ''مقدمۂ مشکوۃ'' ۱۹۹۵ء میں مولانا مفتی محمود بارڈولی صاحب زید مجدہ نے حضرت کی اجازت سے کچھ اضافہ اور ترتیب دے کر ''مبادیاتِ حدیث'' کے نام سے شائع کیا۔ اس مقدمہ میں حدیث کے متعلق بہترین معلومات مثلاً: علمِ حدیث کی تعریف، موضوع، غرض وغایت، وجہِ تسمیہ، علمِ حدیث پر شبہات کے جوابات، حجیتِ حدیث، تدوین، اجناس، مرتبۂ حدیث، حکمِ شرعی، انواعِ کتبِ حدیث، طبقاتِ کتبِ حدیث، تقسیم حدیث، مقدمۃ الکتاب وغیرہ مفید عنوانات کے ساتھ ساتھ سترہ ائمۂ حدیث کے دل چسپ حالات پر مشتمل یہ کتاب اس بات کی متقاضی تھی کہ اسے جدید طرز پر خوبصورت انداز میں شائع کیا جائے۔ ساتھ ہی اس زمانہ کے اسلوب کے مطابق حوالہ جات کا اہتمام بھی کیا جائے، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ اس پر تحقیق وحاشیہ کا کام ہو، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ محض اس کے فضل وکرم سے یہ سعادت راقم کے حصہ میں آئی، چنانچہ بزرگوں کے حکم پر یہ کام شروع کیا اور الحمد للہ چند دن میں یہ مکمل ہوگیا۔ آیات کا حوالہ، احادیث کی تخریج، بعض مواقع پر کچھ اضافہ کی ضرورت محسوس کی تو وہاں اضافہ بھی کیا گیا۔ بعد میں حضرت الاستاذ دامت برکاتہم نے من وعن اسے ملاحظہ بھی فرمایا اور جہاں مناسب سمجھا اصلاح فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اسے حدیثِ پاک کی ادنیٰ خدمت شمار فرمالے۔ حضرت موصوف اور مرتب ومحشی کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

مرغوب احمد لاجپوری

پہلا باب

رؤسِ ثمانیہ

رؤس ثمانیہ

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفى، خصوصاً منهم على سيد الأنبياء، وعلى آله و صحبه المرتضى.

ہر علم وفن کے شروع کرنے سے پہلے چند امور بطور مبادی[1] ومقدمہ[2] کے بیان کیے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے اس علم وفن کی تحصیل میں طالب کے لیے سہولت پیدا ہو جاتی ہے، وہ امور کل آٹھ ہیں، جن کو حکما ومناطقہ کی اصطلاح میں ''رؤسِ ثمانیہ''[3] سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ آٹھ امور یہ ہیں:

[۱]: علم کی تعریف۔

[۲]: موضوع۔

[۳]: غرض وغایت۔

[۴]: سمتہ، یعنی وجہ تسمیہ۔

---

① المبادي: هي الأشياء التي يبتني عليها العلم. [مقدمة اعلاء السنن: ۱/۱۸]

② مقدم من قدم بمعنى تقدم، وهي مأخوذة من مقدمة الجيش، وهی نوعان: مقدمة العلم، ومقدمة الكتاب. [المرأت للشير كوتي ص: ۳]

③ اعلم: أن القدماء كانوا يذكرون في مبادي الكتب أشياء ثمانية و يسمونها الرؤس الثمانية. [مرقاة ص: ۶۲]

[۵]: مؤلف۔

[۶]: اجناس۔

[۷]: مرتبہ۔

[۸]: قسمت وتبویب۔

لیکن ہم مسلمانوں کے لیے ایک نواں امر بھی جاننا ضروری ہے، اور وہ ہے اس کا شرعی حکم، یعنی شریعت کے اعتبار سے اس کا مرتبہ کیا ہے، آیا سنت ہے یا واجب؟ حلال ہے یا حرام؟ جائز ہے یا ناجائز؟ وغیرہ؛ مثلاً: علمِ سحر حرام ہے، اور علمِ قرآن وحدیث واجب ہے۔

تعریف کا مقصد

تعریف کا مقصد اجمالی تعارف ہے؛ ورنہ تو فن مجہول رہتا ہے، اور مجہول چیز کا حصول عقلاً محال ہے، اس لیے تعریف کے ذریعے فن کو جہالت سے نکالنا ہوتا ہے۔

امرِ اول: علم حدیث کی تعریف

پہلے زمانہ میں محدثین کا دستور یہ تھا کہ احادیث کیف ما اتفق اور بلا کسی خاص ترتیب کے لکھا کرتے تھے، بہت سے بہت یہ کرلیا کرتے تھے کہ اگر کوئی لفظ محتاجِ تفسیر وقابلِ تشریح ہوتا تو اس کو حاشیہ پر تحریر کردیا کرتے تھے، اس کے بعد جب متأخرین کا دور دورہ ہوا تو انھوں نے اس کو مہذب بنایا، رواۃ کی چھان بین فرمائی، ''ضعیف رواۃ'' کو ''ثقہ رواۃ'' سے ممتاز فرمایا، اسی وجہ سے

علمِ حدیث کی تعریف میں فرق واختلاف ہوگیا۔ (۳)

[۱]: متقدمین میں سے بعض نے کہا کہ: علمِ حدیث ان قوانین کا نام ہے جن سے جناب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال واحوال وافعال کی صحت وسقم معلوم ہو۔

علامہ زرقانیؒ نے ''شرح بیقونیہ'' میں علمِ حدیث کی تعریف یہ کی ہے:

''إن علم الحديث علم بقوانين، اى قواعد يعرف بها احوال السند والمتن من صحة وحسن'' (۴)

یعنی علمِ حدیث ایسے قوانین کے جاننے کا نام ہے کہ اس سے سند و متن کے احوال یعنی صحت وسقم معلوم ہو، اور یہی تعریف علامہ سیوطیؒ نے اپنی الفیہ میں کی ہے ؎

عِلْمُ الْحَدِيْثِ ذُوْ قَوَانِيْنَ تُحَدُّ   يُدْرىٰ بِهَا أَحْوَالُ مَتْنٍ وَسَنَدٍ (۵)

لیکن یہ تعریف اب مطلق علمِ حدیث کی نہ رہی؛ بلکہ اب یہ تعریف بھی ایک مستقل علم کی تعریف ہوگئی اور ایک مستقل اصطلاح بن گئی، جس کا نام اصولِ حدیث ہے۔ (۶)

(۳) اور یہ اختلاف ایک خلط پر مبنی ہے، چونکہ علمِ حدیث یا فنِ حدیث الگ چیز ہے، اور حدیث شریف یہ ایک الگ ہے، جیسے: قرآن کریم اور علم تفسیر، اگر اس فرق کو ملحوظ رکھا جاوے تو کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

(۴) [تدریب الراوی: ۱/۲۲]

(۵) [مقدمۂ اوجز: ۱/۵۳] ترجمہ: علمِ حدیث ایسے قوانین ہوتے ہیں جن سے متن وسند کے احوال معلوم ہوتے ہیں۔

(۶) اصولِ حدیث کی ایک بہترین تعریف وہ ہے جو حافظ ابن حجر مکیؒ نے کی ہے: معرفة القواعد المعرفة بحال الراوي والمروي. [تدریب الراوی: ۱/۲۶]

[۲]: دوسری تعریف یہ کی گئی کہ: علمِ حدیث وہ فن ہے جن سے روایت کا درجہ معلوم ہو جائے؛ لیکن اب یہ تعریف بھی علمِ حدیث کی تعریف نہیں کہلائے گی؛ بلکہ یہ ایک مستقل فن ہے جس کو ''علمِ عللِ حدیث'' کہا جاتا ہے۔

[۳]: تیسری تعریف یہ کی گئی ہے کہ: علمِ حدیث وہ علم ہے جس سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال وافعال واحوال کی شرح معلوم ہو؛ لیکن اب یہ تعریف ''درایتِ حدیث'' کی کہلاتی ہے، مطلق حدیث کی نہیں؛ چونکہ فن حدیث کی ساٹھ (۶۰) انواع ہو چکی ہیں، اس لیے ہر ایک کی تعریف الگ ہوگی، ''روایتِ حدیث'' اور ہے، ''درایتِ حدیث'' اور ''اصولِ حدیث'' اور ہے، ''عللِ حدیث'' اور، اسی طرح اس کے علاوہ بھی، اور جو تم پڑھو گے وہ علمِ حدیث کی ساری انواع نہیں ہیں؛ بلکہ یہ صرف علمِ روایتِ حدیث ہے جس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ:

حدیث شریف کی تعریف

[۱]: وہ علم ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال، افعال، اور احوال معلوم ہو جائیں۔ ''علم یعرف به أقوال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و أفعاله و أحواله''[۱]

اشکال

اب یہاں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اقوال وافعالِ صحابہؓ وتابعین پر بھی تو علمِ حدیث کا اطلاق ہوتا ہے؛ چنانچہ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' اور ''مصنف

---

(۱) [عمدۃ القاری: ۱/۱۱۔ الکرمانی: ۱/۱۲]

عبدالرزاق‘‘ میں احادیثِ مرفوعہ کے مقابلہ میں صحابہ وتابعین کے اقوال وافعال وغیرہ زیادہ ہیں، باوجود اس کے ان کتب کو بھی احادیث کے ذخیرہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

اشکال کے کئی جوابات

جوابِ اول: صحابہ وتابعینؒ کے اقوال وآثار دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ مدرک بالقیاس ہوں گے، یا غیر مدرک بالقیاس، اگر غیر مدرک بالقیاس ہیں تو وہ احادیثِ مرفوعہ ہی کے حکم میں ہیں، اور جو حیثیت و مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال کا ہے وہی ان کا بھی ہوگا[۹]، اور اگر وہ مدرک بالقیاس ہوں تو ان کو احادیثِ مرفوعہ اور اقوالِ شریفہ پر پرکھا جائے۔

جوابِ دوم: بعض حضرات نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا کہ صحابہ وتابعینؒ کے جو اقوال وغیرہ احادیث کے موجودہ ذخیرہ میں پائے جاتے ہیں وہ صرف اس وجہ سے ملتے ہیں کہ وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں، تو گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہونے کی وجہ سے تبعاً ان کے اقوال مذکور ہیں، ہاں! جن کتابوں میں احادیثِ مرفوعہ کم ہیں اور زیادہ تر صحابہؓ کے اقوال و افعال شامل ہیں، اس کا نام علمِ حدیث ہے ہی نہیں؛ بلکہ اس کا نام محدثین کے نزدیک ’’علم الآثار‘‘[۱۰] ہے۔

---

[۹] غیر مدرک بالقیاس ہوں تو بر بنائے حسن ظن یہ تصور کیا جائے گا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے نقل کیا ہے، اور اپنی طرف سے بیان نہیں کیا؛ اگر چہ نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت نہیں کی۔

[۱۰] [نفحات التنقیح: ۱/ ۸]

جوابِ سوم: اور بعض لوگوں نے اس اشکال سے بچنے کے لیے سرے سے تعریف ہی بدل دی، اور اس طرح تعریف کی کہ: علمِ حدیث وہ علم ہے جس سے حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال، افعال واحوال اور صحابہ وتابعین کے اقوال، افعال واحوال معلوم ہوں، چنانچہ ''فتح الباقی شرح ألفیۃ العراقی'' میں ہے:

"الحديث ويرادفه الخبر على الصحيح-: ما أضيف إلى النبي صلى الله عليه وآله وسلم قيل: أو إلى صحابي أو إلى من دونه قولاً أو فعلاً أو تقريراً أو صفةً ويعبر عن هذا بعلم الحديث، ويحد بأنه علم يشتمل على نقل ذلك، وقال الاجهوري في "حاشيته على شرح البيقونية": و علم الحديث أي رواية، قال شيخ الإسلام والحديث ويرادفه الخبر على الصحيح: ما أضيف إلى النبي صلى الله عليه وآله وسلم أو إلى صحابي أو إلى من دونه قولاً أو فعلاً أو تقريراً أو صفةً، ويعبر عن هذا بعلم الحديث رواية، ويُحَدُّ بأنه علم يشتمل على نقل ذلك"[11]۔

موضوع کا مقصد

[۱]: موضوع[12] کے ذریعے سے فنون میں آپس میں امتیاز ہوتا ہے۔

[۲]: فن کی شرافت وعظمت موضوع کے ذریعے ہوتی ہے، اس لیے موضوع جتنا اونچا ہوگا فن اتنا ہی اونچا ہوتا ہے۔

---

[11] [اوجز: ۱/ ۵۳، ۵۴]

[12] والموضوع: ما يبحث في ذلك العلم عن أغراضه الذاتية.
[مقدمة إعلاء السنن: ۱/ ۱۸]

امرِ ثانی: موضوع

عام طور پر علماء نے حدیث کا موضوع ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ پاک'' لکھی ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکت سے ہی اِس فن میں بحث کی جاتی ہے [۱۳] کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، کھانا، پینا یہ سب امور کیسے اور کس طریقے سے ہوتے تھے؛ لیکن جلیل القدر محقق علامہ محی الدین کافیجی [۱۴] کا اس پر یہ اعتراض ہے کہ آدمی کی ذات تو علمِ طب کا موضوع ہے؛ لہذا حدیث کے موضوع کے ساتھ طب کا موضوع کیسے خلط ہو گیا؟ یہ اعتراض اگرچہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا، اہمیت اس لیے نہیں رکھتا کہ علمِ طب کا موضوع بدنِ انسان ہے، جو عام ہے، اور حدیث کا موضوع ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جو اس کا ایک فرد ہے۔

لیکن علما نے اس کا جواب یہ دیا کہ یہاں حیثیت کی قید محذوف ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ پاک علمِ حدیث کا موضوع ہے اس حیثیت سے کہ جناب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس توجیہ سے دونوں علوم کے موضوع میں تمایز ہو گیا [۱۵]۔

قال السيوطي: ولم يزل شيخنا العلامة محيي الدين الكافيجي يتعجب من قوله: إن موضوع علم الحديث ذات الرسول، ويقول:

---

[۱۳] [الكرماني: ١/١٢۔ تدريب الراوي: ١/٢٧]

[۱۴] الكافيجي: بكسر الفاء، نسبة إلى كافية ابن الحاجب لكثرته قراءته وإقرانه لها.
[حاشیۃ تدریب الراوی: ١/٢٢]

[۱۵] [تدریب الراوی: ١/٢٧]

هذا موضوع الطب لا موضوع الحديث، وأنا أتعجب من الكافيجي كيف التبس عليه ذلك بالطب، فإن ذاته صلى الله عليه وآله وسلم من حيث إنه نبي أو رسول الله لا مدخل للطب في ذلك، نعم! لو تعجب من أن هذا موضوع لمطلق علم الحديث الجامع لأنواعه كان وجيهاً، أما المخصوص بعلم الرواية فيكون موضوعه أيضا مخصوصاً، فقيل: موضوعه ذات النبي صلى الله عليه وآله وسلم من حيث أقواله وأفعاله وتقريراته وأوصافه كذا في لُقط الدُّرر، والأوجه عندي أن موضوعه المرويات والروايات من حيث الاتصال والانقطاع، وأما ذاته الشريفة صلى الله عليه وآله وسلم فموضوع لمطلق علم الحديث دون النوع الخاص منه، وهو علم رواية الحديث۔ (مقدمة أوجز: ۱/۵۵)

اِس مقام پر دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جس طرح حدیث کی تعریف میں صحابہؓ کے اقوال وافعال شامل ہیں اوران سے بحث کی جاتی ہے، ایسے ہی موضوع کے اندر بھی یہ اقوال وافعال شامل ہونے چاہیئے، بعض محدثین نے اس اعتراض کی وجہ سے صحابہؓ کے اقوال وافعال کو بھی موضوع میں شامل کرلیا، اور بعض دوسرے محدثین نے یہ جواب دیا کہ صحابہؓ کے اقوال وافعال سے جو بحث کی جاتی ہے وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہونے کی نسبت سے کی جاتی ہے، تو گویا اِس نسبتِ نبوی کی وجہ سے ان حضرات کے اقوال بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرموداتِ شریفہ میں سے ہو گئے۔ اسی قسم کا اعتراض پہلی بحث میں تعریف پر بھی آچکا ہے، بس اتنا فرق ہے کہ جو

محدثین موضوع کی تبدیلی کے قائل ہیں ان کی تعداد کم ہے، اور وہاں جن محدثین نے اعتراض سے بچنے کے لیے تعریف میں ردوبدل کردی ان کی جمعیت زیادہ ہے۔

غرض وغایت سے مقصود

انسان غرض کا بندہ ہے، جب تک ثمرہ معلوم نہ ہو وہاں تک دلچسپی نہیں لیتا۔

امرِ ثالث: غرض وغایت

''غرض'' کہتے ہیں اس مقصد اور نتیجہ کو جس کے حاصل کرنے کے لیے کوئی فعل کیا جائے، مثلاً: بازار جاکر کوئی چیز خریدنا۔ اور ''غایت'' وہ نتیجہ ہے جو اس پر مرتب ہو؛ لہذا بازار کسی شیء کو خریدنے کے لیے جانا تو غرض ہے اور اس شیٔ کا خریدنا غایت ہے، غرض وغایت دونوں مصداق کے اعتبار سے ایک ہیں، صرف ابتدا اور انتہا کا فرق ہے، چنانچہ عقلا اور سمجھدار لوگوں کے نزدیک غرض وغایت ایک ہی ہے؛ کیونکہ ان کے یہاں اکثر غرض پر غایت مرتب ہوتی ہے، بخلاف بیوقوفوں واحمقوں کے کہ ان کے یہاں غرض پر غایت بہت کم مرتب ہوتی ہے، مثلاً: دہلی جانا یہ تمہاری غرض ہے، تو اگر تم ہوشیار ہو تو اسی سڑک سے جاؤ گے جو دہلی جاتی ہے، اس صورت میں یقیناً دہلی پہنچ جاؤ گے، اور اگر بیوقوفی کی وجہ سے بجائے دہلی کی سڑک اختیار کرنے کے بمبئی کی طرف نکل پڑے، تو غرض (دہلی جانا) تو موجود ہے؛ لیکن راستہ غلط اختیار کرنے کی وجہ سے غایت (دہلی پہنچنا) مرتب نہ ہوگی۔

پہلی غرض: روایتِ حدیث

اب علمِ حدیث کی غرض وغایت کیا ہے؟ علمائے اہلِ فن فرماتے ہیں کہ: علمِ حدیث کی غرض وہ دعائیں اور فضیلتیں حاصل کرنا ہے جو حدیث پڑھنے، پڑھانے والوں کے لیے احادیث میں وارد ہوئی ہیں، مثلاً: حضورِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

"نضَر الله عبداً سمع مقالتي فحفظها و وعاها و أدّاها فربّ حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه إلى من هو أفقه منه"[۱۹]

اس قسم کی اور سینکڑوں دعائیں مذکور ہیں؛ لیکن اس جملہ میں علما کا اختلاف ہورہا ہے کہ یہ جملہ دعائیہ ہے یا خبریہ؟[۱۰] کوئی بھی ہو، دونوں ایک سے ایک بڑھ کر ہے تو پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعا کا کیا پوچھنا، سرتاپا خیر ہی خیر ہے، اور اگر جملہ خبریہ ہے، تو اشکال ہوگا کہ ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ حدیثِ پاک کی خدمت میں مشغول ہیں؛ لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ پژمردہ اور غمزدہ رہتے ہیں؛ لہذا یہ خبر اس پر کہاں صادق آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ظاہر بیں ہیں اور آخرت سے بے بہرہ ہیں ان کے نزدیک تو فقرو فاقہ، بربادی اور مشکلات کا سبب ہے؛ لیکن فقر و فاقہ حقیقت میں بربادی کا سبب نہیں، ورنہ جناب نبیٔ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم فقر و فاقہ کو اپنے ارادہ سے کیوں اختیار

---

[۱۹] [مشکوۃ، کتاب العلم، الفصل الثانی ص:۳۵]

[۱۰] [مرقاۃ المفاتیح: ۱/۲۸۸]

فرماتے؟[۱۹] جولوگ اس میں مبتلا ہیں وہی اس کی لذت جانتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں، مثلاً: ایک حدیث میں ہے:

"اللَّهمَ ارحم خلفائي، قلنا: يا رسول الله! مَنْ هم خلفائك؟ قال: الذين يأتون من بعدي يرون أحاديثي ويعلّمونها الناس"[۱۹]

اس حدیث پاک میں بھی حدیث سے شغف رکھنے والوں کو اپنا نائب اور خلیفہ قرار دیا[۲۰]۔

---

[۱۹] قال رسول الله ﷺ: عرض عليّ ربي ليجعل لي بطحاء مكة ذهبا، فقلت: لا يا ربي ولكن أشبع يوماً وأجوع يوماً الخ. [مشکوۃ، کتاب الرقاق، الفصل الثانی ص: ۴۴۲]

[۱۹] اس روایت کو طبرانی نے "اوسط" میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ [مجمع الزوائد، كتاب العلم، باب فضل العلماء ومجالسهم: ۱/۱۲۶] وأخرجه أبو نعيم أحمد بن عبدالله الحافظ من طريق الطلحي، هذا في [أخبار أصبهان: ۱/ ۸۱۔ والغزالي في الإحياء: ۱/۱۱] والسيوطي في مفتاح الجنة. [درسِ ترمذی: ۱/۲۰]

علامہ سیوطیؒ نے جامع صغیر میں ان الفاظ سے یہ روایت نقل کی ہے: اللّٰهم ارحم خلفائي، الذين يأتون من بعدي، الذين يرون أحاديثي و سنتي و يعلّمونها الناس. [فيض القدير ۲/۱۸، ح: ۱۵۴۴]

اس حدیث کو بعض محدثین نے ضعیف؛ بلکہ بعض نے موضوع قرار دیا ہے؛ لیکن قاضی عیاضؒ نے "الألماع إلى معرفة أصول الرواية وتقييد السماع" میں "باب في شرف علم الحديث وتشرف أهله" [ص: ۱۷] کے تحت اس حدیث کو بہت سی اسانید سے روایت کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث بے اصل نہیں ہے۔ [درسِ ترمذی: ۱/ ۲۰]

[۲۰] محدثین نے اس بشارت میں فقہا کو بھی شامل فرمایا ہے، علامہ مناویؒ اس حدیث کی تشریح میں لفظ "سنن" پر کلام فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: وقد يقال: أراد بها هنا الطريقه المسلوكة في الدين وان كان من كلام التابعين فمن بعدهم من المجتهدين فيدخل فيه الفقهاء. [فيض القدير: ۲/۱۸۸]

قابلِ غور بات

غور کرو! اگر کسی چھوٹے سے شیخ کی خلافت کسی کو مل جائے تو کتنی خوشی اور کتنا شور ہوتا ہے، اور کتنی بڑی بات سمجھی جاتی ہے، اور یہاں تو سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت مل رہی ہے [۲۱]۔

محدثین کو خلفاء کیوں فرمایا؟

حدیثِ مذکور میں حضراتِ محدثین کو خلفا اس لیے فرمایا کہ مسلمانوں تک بطورِ خیر خواہی سنتوں کو پہنچانا انبیا علیہم السلام کا منصب ہے تو جو آدمی اس خدمت کو انجام دے گا گویا کہ وہ ان کا نائب ہے۔

محدثین کی ایک اور فضیلت

ایک اور حدیث میں وارد ہے: ''إنّ أولی النّاس بي یوم القیامة أکثرهم عليّ صلوة'' [۲۲] یعنی قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ قریب وہ ہوں گے جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجتے ہیں۔ ابنِ حبان اپنی صحیح میں فرماتے ہیں کہ: اس حدیث کا مصداق محدثین حضرات ہیں؛ اس لیے کہ اس امت میں کوئی جماعت ان سے بڑھ کر درود بھیجنے والی نہیں ہے [۲۳]، اس کے علاوہ

---

[۲۱] وهذه منقبة لأهل الحدیث العالمین العاملین أعظم بها من منقبة [حوالہ سابق]

[۲۲] [سننِ ترمذی: أبواب الوتر، باب ماجاء في فضل الصلوة علی النبي ﷺ ۱/۱۱۰، مشکوة: باب الصلوة علی النبي ﷺ وفضلها، الفصل الثاني: ۸۶]

[۲۳] قال ابن حبان عقب هذا الحدیث: في هذا الخبر بیان صحیح .... ←

اور بہت سی روایتیں ہیں جو ''مشکوۃ'' میں تم پڑھو گے۔

دوسری غرض: دین کی تشریح

علمانے علمِ حدیث کی دوسری غرض یہ بیان فرمائی ہے کہ دین کا مدار علمِ حدیث پر ہے؛ کیونکہ اصل دین یعنی قرآنِ پاک تو مجمل ہے اس کی تبیین اور توضیح کی ضرورت ہے، اور وہ احادیث سے ہوسکتی ہے، قرآنِ پاک میں نماز اور زکوۃ کا تو حکم ہے؛ لیکن ان کی رکعات ومقدار وغیرہ کچھ نہیں، یہ سب احادیث سے ثابت ہیں، اس لیے یہ غرض بھی سب سے اہم ہے؛ کیونکہ قرآنِ پاک اصل دین اور مدارِ شریعت ہے، اور اس کی شرح حدیثِ پاک ہے، تو بغیر شرح کے متن کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟ اس اعتبار سے حدیث کا پڑھنا اہم ہوگیا۔ امام ابوحنیفہؒ کا مقولہ ہے: لو لا السنة ما فهم أحدمنا القرآن [۳۳]۔

تیسری غرض: محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

تیسری غرض حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے بتلائی کہ اگر علمِ حدیث پڑھنے، پڑھانے سے خواہ کوئی فائدہ نہ ہو اور خواہ کوئی بھی ثواب نہ ملے، تب بھی اس کے پڑھنے کے لیے ایک غرض یہ کافی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام ہے، ہم محبِ رسول ہیں اور آپ سے سچی محبت کے

⊃ علی أن أولی الناس برسول الله ﷺ في القیامة یکون أصحاب الحدیث إذ لیس في هذه الأمة قوم أکثر صلوة منهم. [مرقاة ۲: /۳۴۰]

[۳۳] [مقدمة التعلیق الصبیح شرح مشکاة المصابیح: ۱/ ۳ بحوالۂ المیزان الکبری للشعراني: ۵۲]

دعویدار ہیں؛ لہذا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کو محض اس لیے پڑھنا چاہیے کہ ایک محبوب کا کلام ہے[۳۵] اور جب اس کو محبت کے ساتھ پڑھا جائے گا تو ایک قسم کی لذت، حلاوت، رغبت پیدا ہوگی، جیسے: اگر کوئی عشق میں پھنسا ہوا ہو اور اس کے معشوق کا خط آجائے، تو اگر وہ حدیثِ پاک کے سبق میں بھی ہوگا تو اسی کو پہلے پڑھے گا، اور کھانے کے درمیان آجائے تو کھانا بند کردے گا، اور نماز کے اوقات میں جیب ہی پر نظر رہے گی، جب اس ناپاک کے خط کو پڑھنے کا اتنا شوق وذوق ہے پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا کلام تو اس سے بدرجہا قابلِ صد اہتمام ہے[۳۶]۔

چوتھی غرض: شانِ صحابیت کی جھلک

چوتھی غرض حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے بیان فرمائی ہے کہ: غور وفکر کیا جائے اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر علم کی ایک خاصیت ہوتی ہے، اور اس سے علم سے وابستگی کی وجہ سے نفسِ انسانی میں ایک خاص کیفیت ۔خواہ بری ہو یا بھلی۔ پیدا ہوجاتی ہے، علمِ حدیث سے وابستگی اور مزاولت انسان میں صحابیت کی شان پیدا کردیتی ہے؛[۳۷] کیونکہ صحابیت کے معنی دراصل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے جملہ احوال سے واقفیت اور عبادات اور عادات میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اوضاع واطوار کا مشاہدہ کرنے کے ہیں، اور یہ بات امتدادِ زمانہ کی وجہ سے اس شخص کی قوتِ مدرِکہ اور متخیلہ میں جو اس

---

(۳۵) [مقدمہ اوجز: ۱/۵۵]

(۳۶) [تقریر بخاری: ۱/۷]

(۳۷) [عجالۂ نافعہ: ۳]

سے وابستگی رکھتا ہے ایسی جم جاتی ہے اور راسخ ہو جاتی ہے کہ مشاہدہ کے حکم میں ہوتی ہے؛ چنانچہ حسبِ ذیل شعر میں اس طرف اشارہ ہے۔ ؎

أَهْلُ الْحَدِيثِ هُمْ أَهْلُ النَّبِيِّ وَإِنْ

لَمْ يَصْحَبُوا نَفْسَهُ وَأَنْفَاسَهُ صَحِبُوا

یعنی محدثین ہی اہلِ نبی ہیں اور انہیں گو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صحبت حاصل نہیں؛ مگر آپ کے انفاسِ قدسیہ کے ساتھ شرف صحبت حاصل ہے۔

خلاصۂ کلام

یہاں تک تم کو تین امور معلوم ہو گئے، علمِ حدیث کی تعریف؛ جس کا خلاصہ تدبّر ہے، اور علمِ حدیث کا موضوع؛ جس کا خلاصہ عظمت ہے، اور علمِ حدیث کی غرض و غایت؛ جس کا خلاصہ لذت ہے؛ لہذا جب تم حدیثِ پاک کو تدبّر، عظمت اور لذت کے ساتھ پڑھو گے تو اس پر غایت مرتب ہو گی، اور اگر توجہ اور التفات سے نہ پڑھو گے تو محرومی ہے۔ (العیاذ باللہ)

امرِ رابع: وجہ تسمیہ

اس فن کا نام ''حدیث'' ہے، اور اس کی وجہِ تسمیہ میں دو قول ہیں: اول یہ کہ حدیث، حادث کے معنی میں ہے[۲۹]، اور اس معنی کے لحاظ سے اس علم کو

[۲۹] وأما الحديث فأصله: ضد القديم، وقال شيخ الإسلام ابن حجر في شرح البخاري: المراد بالحديث في عرف الشرع "مايضاف إلي النبي ﷺ" وكأنه أريد به مقابلة القرآن لإنه قديم. [تدریب الراوی: ۱/ ۲۹]

''حدیث'' اس وجہ سے کہتے ہیں کہ علم کی دو ہی قسمیں ہیں: ایک قدیم وہ تو قرآن ہے اور اللہ کا کلام ہے، جو اس کی صفت ہے، جب ذاتِ باری قدیم ہے تو اس کی صفت بھی قدیم ہوگی۔ دوسری قسم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام ہے، لامحالہ یہ حادث ہوگا؛ اس لیے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حادث ہیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت بھی حادث ہوگی، ان دو کے علاوہ اور کوئی علم ہے ہی نہیں۔

اب یہاں پر کوئی یہ اشکال کرسکتا ہے کہ حنفیہ کے یہاں تو فقہ بہت اونچا سمجھا جاتا ہے جو بظاہر ان دونوں علوم سے الگ تھلگ ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ فقہ قرآن وحدیث سے الگ کوئی چیز نہیں؛ بلکہ یہ درایتِ حدیث ہے کہ ہر ایک مجتہد نے مختلف احادیث کے مجموعہ سے کوئی حدیث لے کر اس کی سند حذف کر کے لکھ دیا کہ یہ معمول بہا ہونا چاہیے، دوسرے مجتہد نے دوسری حدیث کو راجح سمجھ کر اس کو معمول بہا بنا دیا، تو درحقیقت فقہ؛ قرآن وحدیث سے الگ چیز نہیں ہوئی، جو لوگ احناف پر اعتراض کرتے ہیں وہ یا تو لاعلمی کی وجہ سے کرتے ہیں یا تجاہلِ عارفانہ [۲۵] برتتے ہیں، علمِ فقہ؛ قرآن وحدیث کے معارض ومنافی نہیں؛ بلکہ علمِ فقہ ان دونوں کا خلاصہ ہے، فقہا نے غور وفکر کر کے قرآن وحدیث کے مسائل کو آسانی کے واسطے ایک جگہ جمع کر دیا جس کا نام علمِ فقہ ہوگیا، امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے:

---

[۲۵] تجاہلِ عارف: یہ علمِ بدیع کی محسِّنات معنویہ کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ متکلم کو ایک وجہ معلوم ہے؛ لیکن تعجب، تعریف، ذم، ڈانٹ یا انکار کے لیے اُس وجہ سے ناواقفیت کا اظہار کر رہا ہے [دیکھیے: ''تحفۃ الطلباء'' ص: ۲۰۴]

"جميع ما تقول له الأئمة شرح للسنة، وجميع السنة شرح للقرآن"[30]

اور فقہا نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ ایک عالم کو تو حدیث سے مسئلہ مل جائے گا؛ مگر عامی شخص کو نہیں ملے گا، جیسے: حدیث میں بحالتِ صوم اپنی بیوی کا بوسہ لینے کی اجازت بھی ہے اور ممانعت بھی[31] یہاں عامی کیا کرسکتا ہے!! اس کے سامنے تو مسائل کی شکل وہ ہونی چاہیے جس پر وہ عمل کرسکے؛ چنانچہ مجتہدینؒ نے غور وفکر کر کے بتلایا کہ حدیثِ نہی جوان کے لیے ہے، اور حدیثِ اباحت بوڑھے کے لیے، کیونکہ جوان بے قابو ہوسکتا ہے؛ مگر بوڑھا نہیں ہوگا۔

یہی حال علمِ تفسیر کا ہے کہ وہ بھی قرآنِ پاک کی شرح ہے، اسی طرح اصولِ فقہ مستقل کوئی فن نہیں؛ بلکہ اس میں فقہ کے دلائل مذکور ہیں۔

دوسری وجہِ تسمیہ

دوسری وجہِ تسمیہ یہ بتلائی گئی ہے کہ حدیث کے معنی بات کے ہیں، اور چونکہ یہ جناب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں ہیں اس لیے ان کو حدیث کہا جاتا ہے، اس

---

(30) [مقدمة التعليق الصبيح: ۳۹/۱]

(31) أن النبي ﷺ كان يُقَبِّل في شهر الصوم. [ترمذی] واختلف أهل العلم من أصحاب النبي ﷺ وغيرهم في القُبلة للصائم، فرخص بعض أصحاب النبي ﷺ في القبلة للشيخ، ولم يرخصوا للشاب. [ترمذی: باب ما جاء في القُبلة للصائم]

ابوداود شریف کی ایک روایت میں "مباشرة" کے متعلق یہ صراحت آئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو اجازت دی، دوسرے کو منع فرمایا، جنہیں اجازت دی وہ بوڑھے تھے، اور جنہیں منع فرمایا وہ جوان تھے۔ [مشكوة: كتاب الصوم، باب تنزيه الصوم، الفصل الثاني]

پر یہ اشکال ہے کہ احادیث میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں کہاں ہیں؟ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال واحوال بھی مذکور ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال وافعال کو تغلیباً احادیث کہا جاتا ہے۔

تیسری وجہِ تسمیہ

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مقدمہ ''فتح الملہم''[۳۲] میں وجہِ تسمیہ یہ بتلائی ہے کہ علمِ حدیث کا یہ نام آیتِ کریمہ ''وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ''[۳۳] سے ماخوذ ہے؛ اس لیے کہ سورۂ ضحیٰ میں پہلے باری تعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنے بڑے اور اہم انعامات واحسانات شمار فرمائے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یتیم ہونے کے بعد آپ کو پناہ دینا، اور فقیر ہونے کے بعد غنی کرنا، اور ان شرائع و احکام سے (جن کا ادراک عقل خود نہیں کرسکتی) بے خبری کے بعد ان سے آگاہ و ہدایت یافتہ کرنا کمافی قولہ تعالیٰ ''مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِيۡمَانُ'' الخ[۳۴]۔

پھر ان تین انعامات پر تین امور کو مرتب فرمایا، یعنی ''نہی عن قھر الیتیم، نہی عن نہر السائل، اور امر بتحدیثِ نعمت'' اور ذوقِ سلیم یہ کہتا ہے کہ ترتیب بطریقِ لف ونشر مشوش ہے؛ نہ بطریقِ لف ونشر مرتب، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، اب مطلب یہ ہوا کہ آپ یتیم، بے خبر، اور فقیر تھے، پس اللہ تعالیٰ

---

[۳۲] [فتح الملہم ۱/۱]

[۳۳] اور جو تمہارے پروردگار کی نعمت ہے، اس کا تذکرہ کرتے رہنا۔ [پ:۳۰، سورۂ ضحیٰ، آیت نمبر:۱۱]

[۳۴] تمہیں اس سے پہلے نہ یہ معلوم تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے، اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔ [پ:۲۵، سورۂ شوریٰ، آیت نمبر:۵۲]

نے آپ کو پناہ دی اور باخبر و ہدایت یافتہ فرمایا اور غنی کر دیا، اب کچھ بھی ہو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اوپر اللہ کے ان تین انعامات کو فراموش نہ فرمائیں، اور اللہ تعالیٰ کی اقتدا کیجیے، پس آپ بھی یتیم پر مہربانی کیجیے، اور سائل پر ترس کھائیے، اس لیے کہ آپ یتیمی اور فقیری کا مزہ چکھ چکے ہیں، اور قول باری تعالیٰ ''وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ'' وہ مقابلہ میں ہے ''وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى''[۳۵] کے، یعنی اس بڑی نعمت (جو ہدایت بعد الضلالت ہے جس کے مقابلہ میں گویا کوئی نعمت ہی نہیں) کا یہی حق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو اللہ کے بندوں کے سامنے بیان فرمائیں، اور اس کو ان میں پھیلائیں، اور ان کی طرف جو بھیجا گیا وہ ان کے سامنے کھول کر واضح فرمائیں، اور ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال وافعال جن کو ہم حدیث سے تعبیر کرتے ہیں یہ سب اُسی ہدایت کی توضیح و تحدیث وتبیین ہے جس سے باری تعالیٰ نے آپ کو نوازا تھا[۳۶]۔

حدیث وخبر کے درمیان نسبت

اب یہاں پر ایک علمی بحث ہے، وہ یہ کہ حدیث کے معنی کلام اور بات کے ہیں، اور خبر کے معنی بھی بات کے ہیں تو آیا اب اس علم کو ''علم الاخبار'' کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ اس کو ''علم الاخبار'' کہا جاسکتا ہے جیسے ''علم الحدیث'' بھی اس کا نام ہے[۳۷]۔

---

[۳۵] اور تمہیں راستے سے ناواقف پایا تو راستہ دکھایا۔ [پ: ۳۰، سورۂ ضحیٰ، آیت نمبر: ۷]

[۳۶] [فتح الملہم: ۱/ ۱]

[۳۷] حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں:

احقر کے نزدیک صاف اور بے غبار بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال وافعال ⇐

اب سوال یہ ہے کہ خبر وحدیث میں کیا نسبت ہے؟ بعض محدثین کی رائے یہ ہے کہ دونوں مساوی ہیں، اور بعض علما کی رائے یہ ہے کہ عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے[۳۹]، بایں طور کہ حدیث تو حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، اور خبر کا اطلاق آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے اخبارِ ملوک پر بھی ہوتا ہے، اخبارِ ملوک کو اخبار ہی کہہ سکتے ہیں حدیث نہیں کہہ سکتے، اور خبر کے عموم ہی کی وجہ سے یہ اخبارات جو شائع ہوتے ہیں ان کو اخبار کہا جاتا ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہوا کہ اگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث پر لفظ خبر کے اطلاق کی وجہ اس کا معنی لغوی ہے (یعنی وہ بات کے معنی میں ہے) تو کلام بھی تو بات کے معنی میں ہے، لہذا حدیث کو کلام کیوں نہیں کہتے؟ جواب یہ ہے کہ کلام تو خبر و

⇐ کے لیے لفظِ "حدیث" کو مخصوص کر لینا استعارۃ العام للخاص کے قبیل سے ہے، اور اس استعارہ کا ماخذ خود رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بعض ارشادات ہیں جن میں خود آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اقوال وافعال کے لیے لفظِ "حدیث" استعمال فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے: حدّثوا عني ولا حرج. [مسلم: ۲: ۴۱۴، کتاب الزهد: باب التثبت في الحديث وحكم كتابة الحديث] اللّهم ارحم خلفائي، قلنا: يا رسول الله! ومن هم خلفاءك؟ قال: الّذين يأتون من بعدي يرون أحاديثي ويعلّمونها الناس. [مرٓ علیٰ ص: ۱۰، ح: ۱۹] من حفظ على أمّتي أربعين حديثا الخ. [مشكوة: كتاب العلم في الفصل الثالث ص: ۳۶] من حدّث عنّي بحديث يرى أنه كذب فهو أحد الكاذبين. [مسلم] اتّقوا الحديث عنّي إلّا ما علمتم فمن كذب عليّ متعمّدًا فليتبوّأ مقعده من النّار. [ترمذی، مشكوة: في الفصل الثاني من كتاب العلم]

بہر حال ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال وافعال کے لیے لفظِ "حدیث" کا استعمال زمانۂ مابعد کی اصطلاح نہیں ہے؛ بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے؛ لہذا اس سلسلہ میں دور دراز کی توجیہات کی کوئی حاجت نہیں۔ [درسِ ترمذی: ۱/ ۲۰]

[۳۹] الخبر عند علماء هذا الفن مرادف للحديث، وقيل: بينهما عموم وخصوص مطلقاً، فكل حديث خبر من غير عكس. [شرحِ نخبۃ الفکر ص: ۸]

حدیث دونوں سے عام ہے؛ مگر چونکہ عرف نے لفظ کلام کو ایک خاص فن وعلم یعنی عقائد کے ساتھ خاص کر دیا ہے، اس لیے اس کا اطلاق بخوفِ التباس؛ حدیث پر نہیں کیا جاتا۔

امرِ خامس: مؤلّف

مؤلف دو ہوتے ہیں: ایک مؤلفِ فن، دوسرے مؤلفِ کتاب۔ یہاں مؤلفِ فن یعنی اس فن کے موجِد اور بانی کا ذکر کرنا ہے، اس لیے کہ یہ مقدمۃ العلم ہے، اور مؤلفِ کتاب کا ذکر آگے آرہا ہے، عام طور سے مشہور ہے کہ حدیث کی تدوین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے ایک سو برس بعد ہوئی؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حدیث کی تالیف اس زمانہ میں ہوئی؛ بلکہ اس کی تالیف اور یادداشت وغیرہ تو خود حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تھی؛ چنانچہ سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ کی احادیث کا ایک مجموعہ تھا[۳۹] جو انہوں نے اپنے بیٹے کے نام لکھا تھا۔

اس مجموعہ کی چھ احادیث امام ابوداودؒ نے اپنی سنن میں روایت کی ہیں، اور جہاں کہیں بھی اس مجموعہ کی کوئی حدیث ''ابوداود'' میں آئی ہے اس کی ابتدا میں یہ الفاظ ہوتے ہیں: امابعد:[۴۰] فانّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا أمّا بعد: قال وغیرہ.

---

[۳۹] حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کہ سلیمان بن سمرۃؒ نے اپنے والد سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے ایک بڑا نسخہ روایت کیا ہے۔ روی عن أبیہ نسخۃ کبیرۃ. [تہذیب التہذیب: ۴/ ۱۹۸] ابن سیرینؒ فرماتے ہیں: إن الرسالۃ التي کتبھا سمرۃ لأولادہ یوجد فیھا علم کثیر. [درسِ ترمذی: ۱/ ۴۰، اسد الغابۃ: ۲/ ۳۵۴]

[۴۰] یہ کلمہ کلام کے ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف انتقال کے لیے بطورِ فصل ←

الفاظ ہوتے ہیں[31] اور اس مجموعہ کی سو کے قریب احادیث "مسندِ بزار" میں ہیں، اس کے علاوہ بہت سے ایسے مجموعے تھے جو خود حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے طور پر قلمبند کر رکھے تھے، بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کے علاوہ کسی کے پاس مجھ سے زیادہ نہ تھیں، وجہ یہ تھی وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور میں زبانی یاد کرلیا کرتا تھا، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتابتِ حدیث کی اجازت لے لی تھی[32]۔

خود عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں جس قدر احادیث سن لیتا تھا ان کو لکھ لیا کرتا تھا، ایک مرتبہ قریش نے مجھے یہ کہہ کر روکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر ہیں بہت سی باتیں غصہ میں کہہ دیتے ہوں گے؛ اس لیے تم حدیثیں نہ لکھو، میں ان کے کہنے سے رک گیا؛ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو

⊃ کے لایا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے اس کو "فصل الخطاب" کہا گیا ہے، تحقیق کے لیے ملاحظہ کریں: (نفحات التنقیح۔ مقدمة العلم ص: ۱۱۸، ۱۱۹)

[31] ابوداود شریف کی ان چھ جگہوں کے حوالہ جات یہ ہیں: (۱): [۱/۶۶، باب: اتخاذ المساجد في الدور، كتاب الصلاة، رقم الحديث: ۴۵۶] (۲): [۱/۱۴۰، باب التشهد: كتاب الصلاة، رقم الحديث: ۹۷۵] (۳): [۱/ ۲۱۸، باب العروض إذا كانت للتجارة هل فيها زكاة؟ كتاب الزكوة، رقم الحديث: ۱۵۶۲] (۴): [۱/۳۴۶، باب في النداء عند النفير يا خيل الله! اركبي، كتاب الجهاد، رقم الحديث: ۲۵۶۰] (۵): [۲/۱۵، باب النهي عن الستر على من غل، كتاب الجهاد، رقم الحديث: ۲۷۱۶] (۶): [۲/۲۹، باب في الاقامة بأرض الشرك، كتاب الجهاد، رقم الحديث: ۲۷۸۷]

[32] ما من أصحاب النبی ﷺ أحد أكثر حديثاً عنه (ای النبي ﷺ) مني إلا ما كان من عبد الله بن عمرو، فإنه كان يكتب ولا أكتب. [بخاری ۱/ ۲۲، باب كتابة العلم، كتاب العلم: رقم الحديث: ۱۱۳]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم لکھ لیا کرو، اِس زبان سے کسی بھی حالت میں ناحق بات نہیں نکل سکتی[۴۳]۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تیار ہو گیا، جس کا نام انہوں نے ''الصادقہ''[۴۴] رکھا تھا، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اس مجموعۂ احادیث کو اپنی زندگی کا متاعِ عزیز سمجھتے تھے، ان کا قول ہے: ''ما یرغبني في الحیاۃ إلا الصادقة'' یہی ''کتاب الصادقہ'' مجھ کو زندگی کا لطف دے رہی ہے، ان کو کسی حال میں اس کی مفارقت گوارا نہ تھی اور اس پر بہت ناز تھا، فخریہ انداز میں کہا کرتے تھے: ''فأمّا الصادقة فصحیفة کتبتها من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''[۴۵] یعنی صادقہ کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سن کر لکھا ہے، یہ صحیفہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی وفات پر ان کے پوتے شعیب بن محمد بن عبداللہ کو ملا تھا [تہذیب التہذیب][۴۶] اور شعیب سے ان کے صاحبزادے عمرو روایت کرتے ہیں۔ (ترمذی)

کتبِ احادیث میں عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جدہ کی سند سے

---

[۴۳] عن عبد اللہ بن عمرو قال: کنت أکتب کل شيء أسمعه من رسول اللہ ﷺ أرید حفظه، فنهتني قریش و قالوا: أتکتب کل شيء تسمعه و رسول اللہ ﷺ بشر یتکلم في الغضب و الرضا؟ فأمسکت عن الکتاب فذکرت ذلک إلی رسول اللہ ﷺ فأومأ بأصبعه إلی فیه، فقال: أکتب فو الذي نفسي بیدہ ما یخرج منه إلا حق. [ابو داود، باب في کتابة العلم: کتاب العلم، رقم الحدیث: ۳۶۴۶]

[۴۴] [ابن سعد: ۲/ ۳۷۳]

[۴۵] [سننِ دارمی: ۱/ ۱۰۵]

[۴۶] [تہذیب التہذیب: ۸/ ۴۹] اور ابن حجرؒ نے حافظ یحیٰ بن معینؒ سے جو الفاظ نقل کیے ہیں کہ ''وجد شعیب کُتُب عبد اللہ'' اس میں لفظ ''کُتُب'' (کتابیں) بتاتا ہے کہ ان کی صرف ایک ہی کتاب نہ تھی؛ بلکہ متعدد کتابیں تھیں جو ان کو ملیں۔ [۸/ ۵۴]

جو حدیث آئی ہے وہ اسی مجموعہ ''الصادقہ'' کی ہوتی ہے [۳۰]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرائض وسنن اور دیت کے مسائل پر مشتمل ایک تحریر لکھوا کر عمرو بن حزم صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اہلِ یمن کے پاس بھیجی تھی [۳۱]، اس نوشتہ کے جستہ جستہ ٹکڑے احادیث وسیر کی کتابوں میں ملتے ہیں ''مستدرکِ حاکم'' میں اس کتاب کی ۶۳ حدیثیں منقول ہیں، اس کے علاوہ ایک نوشتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ یمن کے نام روانہ فرمایا تھا، جس کی حدیثیں ''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں امام شعبیؒ سے مروی ہیں۔

اسی طرح دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے طور پر تحریری مجموعے قلمبند کر رکھے تھے [۳۲]، لہذا حدیث کی کتابت اور جمع تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ہو چکا تھا؛ البتہ کتابی اور تصنیف کی شکل میں یہ ذخیرہ بعد میں منتقل کیا گیا۔

یہ بحث کوئی مہتم بالشان بحث نہ تھی؛ مگر حمقائے زمانہ نے اس کو مہتم بالشان بنا دیا، کیونکہ عام طور سے فرقۂ قرآنیہ (وہ فرقہ جو صرف قرآن کو حجتِ شرعیہ مانتا ہے، حدیث کو نہیں) اور آوارہ قسم کے روشن خیال حضرات خاص طور سے اچھالتے ہیں کہ بھلا ایسی احادیث کا کیا اعتبار جو ایک سو برس بعد لکھی گئیں؛ لیکن یہ لوگ بکواسِ محض کرتے ہیں، ورنہ ابھی معلوم ہو گیا کہ جمع وکتابت

---

[۳۰] [تہذیب التہذیب: ۸/۴۹]

[۳۱] [طحاوی: ۲/۴۱۷]

[۳۲] مثلاً صحیفۂ انس بن مالک رضی اللہ عنہ [دیباچہ صحیفۂ ہمام بن منبہ، از محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب] صحیفۂ علی رضی اللہ عنہ [مستدرکِ حاکم: ۳/۵۷۴] صحیفۂ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ [معجم صغیر للطبرانی: ص: ۲۴۱، ۲۴۲] صحیفۂ ابنِ عباس، صحیفۂ ابنِ مسعود، صحیفۂ جابر بنِ عبد اللہ، صحیفۂ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ [درسِ ترمذی: ۱/۴۰]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے شروع ہو چکی تھی؛ البتہ تصنیف وتبویب بعد میں ہوئی۔

علمِ حدیث کی تاریخی حیثیت

ایک طرف آفتابِ اسلام کی کرنیں حدودِ عرب سے نکل کر کائنات کے درودیوار سے ٹکرائیں، اور اسلامی علوم ومعارف اور ان کے رجال، مکہ، مدینہ، بصرہ، کوفہ، شام، اور مصر وغیرہ سے باہر نکل کر ایشیا، افریقہ اور حدودِ یورپ میں داخل ہوئے، اور دوسری طرف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جو درحقیقت اسلام کے چلتے پھرتے مدرسے اور اسلامی تعلیمات کی جیتی جاگتی تصویر تھے، دنیا سے اٹھنے لگے، اور ابھی صدی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ بزمِ عالم ان کے مبارک وجود سے تقریباً خالی ہو چلی؛ چنانچہ بصرہ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے آخر میں جس نے وفات پائی وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں، آپ کا انتقال سن ۹۳ھ یا ۹۵ھ میں ہوا ہے [۵۰]، یہ وہ وقت تھا کہ دوسرے اسلامی شہروں میں بھی دو چار کبیر السن [۵۱] صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ جو جلد ہی فوت ہو گئے خورشیدِ نبوت سے براہِ راست کسبِ نور کرنے والے تمام ستارے غروب ہو چکے تھے۔

ماہِ صفر سن ۹۹ھ میں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سریر آرائے خلافت ہوئے [۵۲]، آپ کو خلفائے راشدین میں شمار کیا گیا ہے، اور پہلی صدی

---

[۵۰] [سیر الصحابہ: ۳/ ۱۲۲، البدایہ والنہایہ (اردو) ۹/ ۱۶۹] (نوٹ) دونوں میں ۹۵ کا قول نہ ملا۔

[۵۱] مثلاً: ابونعیم الانصاری رضی اللہ عنہ متوفی ۹۶ یا ۹۷ھ [البدایہ والنہایہ (اردو) ۹/ ۲۹۶] ابوامامہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ متوفی ۱۰۰ھ [حوالۂ بالا ص: ۲۷۴] ابوطفیل عامر بن واثلہ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے آخر میں انہیں کی وفات ہوئی، متوفی ۱۰۰ھ، بعض نے ۱۱۰ھ بتلایا ہے۔ [حوالہ بالا]

[۵۲] ۹۹ھ بروزِ جمعہ ماہِ محرم (یا صفر) میں آپ رحمہ اللہ کے دستِ حق پرست پر خلافت کی بیعت ہوئی [البدایہ والنہایہ: ۹/ ۲۶۶، اردو]

کے مجدّد ہیں (۵۳)، آپ نے دیکھا کہ صحابہؓ کے متبرک نفوس سے دنیا خالی ہوچکی، اکابرینِ تابعین میں کچھ تو صحابہؓ کے ساتھ ہی چل بسے، باقی جو ہیں ایک ایک کرکے سارے مقامات سے اٹھتے جارہے ہیں، اس لیے آپ کو اندیشہ ہوا کہ ان حفاظِ اہلِ علم کے اٹھنے سے علومِ شرعیہ نہ اٹھ جائیں، اور حدیثِ پاک کی جو امانت ان کے سینوں میں محفوظ ہے وہ ان کے ساتھ ہی قبروں میں نہ چلی جائے۔

ادھر شیعہ، خوارج، قدریہ، نئے نئے فرقے اسلام میں سر اٹھاتے جاتے تھے، جو اپنے اپنے عقائد وخیالات کی ترویج میں پوری قوت سے کوشاں تھے، اس لیے آپ نے فوراً تمام ممالک کے امرا کے نام فرمان بھیجا کہ علمِ حدیث کے مٹنے اور علما کے اٹھنے کا خوف کرتا ہوں؛ لہٰذا اپنے اپنے بلاد کے علما کو حکم کریں کہ جو حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث ہیں ان کو جمع کریں، چنانچہ مدینہ منورہ کے قاضی وعامل ابوبکر بن محمد بن حزمؒ کے نام جو خط لکھا اس میں یہ عبارت موجود ہے: ''انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فأكتبه، فإني خفت دروس العلم وذهاب العلماء.'' (بخاری) (۵۴)۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث تلاش کرکے قلمبند کرو؛ کیونکہ مجھے آئندہ علم کے مٹنے اور علما کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔

---

(۵۳) شیخ الاسلام بدرالدین ابدالؒ ''رسالہ مرضیہ في نصرة مذهب الاشعريه'' میں تحریر فرماتے ہیں: اعلم: أن المجدد إنما هو كعمر بن عبد العزيز رحمه الله في المئة الأولى الخ. [مجموعۃ الفتاوی: ۱/ ۱۳۱] علامہ لکھنویؒ فرماتے ہیں: ''پہلی صدی کے مجدد بالاتفاق حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں [حوالۂ بالا، ص: ۱۳۳] اس موضوع پر تفصیل دیکھنا ہو تو ''الفوائد الحجة في من يبعثه الله لهذه الأمة'' مؤلفہ: حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور ''متبه بمن يبعثه الله على رأس المئة'' کا مطالعہ کیجیے۔

(۵۴) [بخاری: ۲۰/ ۱، باب كيف يقبض العلم، كتاب العلم]

قاضیٔ موصوف اپنے وقت میں مدینہ کے بڑے علما میں سے تھے، امام مالکؒ ان کے متعلق فرماتے ہیں: ''لم یکن أحد بالمدینة عنده من علم القضاء ما کان عند أبی بکر بن حزم'' (توجیہ النظر ص: ۷) [۵۵] یعنی اس وقت مدینہ میں علمِ قضا کا عالم ان سے بڑھ کر کوئی اور شخص موجود نہ تھا، علاوہ ازیں ان کے پاس آنحضرت ا کے صدقات، دیات، اور سنن کے کچھ احکام بھی وراثتاً موجود تھے، موصوف بڑے عابد وشب بیدار تھے، ان کی اہلیہ کا بیان ہے کہ چالیس سال ہونے آئے یہ کبھی شب میں اپنے بستر پر دراز نہیں ہوئے، آپ نے امیر المؤمنین کے حسبِ ارشاد حدیث میں متعدد کتابیں لکھیں؛ لیکن افسوس کہ قاضی صاحبؒ کا یہ کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ وفات پاچکے تھے، آپ نے ۲۵/ رجب ۱۰۱ھ میں وفات پائی [۵۶]، مدتِ خلافت: ۲/ سال، ۵/ ماہ ہے، یہی مدت کم وبیش حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی بھی ہے۔

احادیث پر ہونے والے اشکالات اور ان کے جوابات

برِّ صغیر میں فنِ حدیث شریف نہایت پُرسکون ماحول میں پڑھایا جاتا ہے، اور پڑھنے والوں کے اذہان میں کوئی خلجان وشک نہیں ہوتا، جس کی اصل وجہ ایک صدی سے اکابرین کی مسلسل محنت اور ہر آبادی میں عامۃُ فضلائے مدارسِ

---

[۵۵] [توجیه النظر إلی أصول الأثر: ۱/ ۴۸] یہ علامہ طاہر بن صالح الجزائریؒ (م، ۱۳۳۸ھ، جو چودہویں صدی کی ابتدا کے مشہور عالم ہیں) کی علمِ اصولِ حدیث میں بڑی جامع کتاب ہے، شیخ عبد الفتاح ابوغدہؒ کی تحقیق وحاشیہ کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

[۵۶] [توجیہ النظر: ۱/ ۴۸]

عربیہ کی ایک معتد بہ تعداد ہے، اس کے بالمقابل موجودہ عرب ممالک میں اور خاص کر شرقِ اوسط[ؒ] میں اس فن کے متعلق عوام کے ذہن میں بہت سارے اشکالات ہیں، جن کی وجوہات یہ ہیں۔

[۱] پچھلی ایک صدی سے اکابرین کی جو محنت یہاں ہوئی وہ وہاں نہ ہوسکی۔

[۲] فضلائے دین کی تعداد میں نہایت کمی۔

[۳] یہود ونصاری کی آبادی کی کثرت، جو مستقل علومِ اسلامیہ کو پڑھ کے اس کے ذریعہ سے حدیث شریف کے متعلق عوام میں شکوک پھیلاتے ہیں، اگر چہ ابھی اس ملک میں یہودی ذہنیت کے مالک بہت سارے غیر مسلم اور نام نہاد مسلم حضرات بھی طرح طرح کے اشکالات علومِ اسلامیہ پر کرنے لگے، ان مشہور اشکالات میں سے صرف چند کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے، باقی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

[۱] احادیثِ شریفہ اسلامی قانون سازی میں حجت نہیں ہے، اگر یہ حجت ہوتی تو دورِ رسالت یا دورِ صحابہ میں اس کو با قاعدہ لکھوادیا جاتا، جیسے قرآنِ کریم لکھوادیا گیا تھا، معلوم ہوا احادیثِ شریفہ ایسی ہیں جیسے بزرگوں کے اقوال۔

[۲] احادیثِ شریفہ کی تدوین ایک طویل دور کے بعد ہوئی ہے تو صحیح اور موضوع روایات میں امتیاز کیسے ہوسکتا ہے؟

یہ جو اشکال کیا جاتا ہے کہ دورِ رسالت میں کتابتِ حدیث کا کام کیوں نہیں ہوا؟ اس کے چند جوابات دیے گئے ہیں:

[ؒ] [شرقِ اوسط، سے مراد: سعودیہ، یمن، خلیجی ریاستیں: عراق، سیریا (شام) ایران، اردن، فلسطین، لبنان، مصر، ترکی کا کچھ حصہ]

پہلا جواب: اس کا یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سینکڑوں کام تھے: جہاد کی مشغولیت، مسائل کا سیکھنا سکھانا، اور پھر حسبِ ضرورت کسب معیشت وغیرہ وغیرہ، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے سینکڑوں مشاغل کے دوران جن میں فتنۂ ارتداد وغیرہ بھی شامل ہے احکامِ فرعیہ کی تدوین کا موقعہ نہیں ملا؛ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس کی تدوین ہوئی۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ صحیح مسلم شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ تم صرف قرآن کو لکھا کرو، میری احادیث مت لکھو، اور جو کچھ تم نے احادیث لکھ لی ہیں ان کو مٹادو[۵۱] تو چونکہ اس حدیث سے ممانعت ثابت ہورہی ہے، اس لیے علمائے سلف میں کتابتِ حدیث کے متعلق تین مذاہب ہوگئے:

۱: ایک جماعت یوں کہتی ہے کہ جب اباحت وممانعت میں تعارض ہوجائے تو ممانعت کو ترجیح دی جائے گی۔

۲: دوسری جماعت یوں کہتی ہے کہ بعض دوسری احادیث سے کتابت کا ثبوت ملتا ہے اس وجہ سے حدیث کا لکھنا لکھانا جائز ہے، مثلاً حجۃ الوداع کے موقع پر ایک صحابی ابوشاہ یمنی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ خطبہ مجھے لکھوا دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "أکتبوا لأبي شاہ"[۵۲] اس خطبہ میں کیا تھا احادیث ہی تو تھیں۔

---

[۵۱] لا تكتبوا عني، ومن كتب عني غير القرآن فليمحه الحديث وحكم كتابة العلم، كتاب الزهد]

[۵۲] [ترمذی:۲/۱۰۷ باب ما جاء في الرخصة فيه، ابواب العلم، رقم الحديث: ۲۶۶۷۔ بخاری ۱:۲۱، ۲۳، باب كتابة العلم، كتاب العلم]

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کا حدیث جمع کرنے کا واقعہ تفصیل سے گذر چکا[۶۰] جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانا: ''اکتب فوالذي نفسي بیده مایخرج منه إلا الحقّ'' (یعنی لکھو اس لیے کہ اس زبان سے غصہ میں یا خوشی میں سوائے حق کے کچھ نہیں نکلتا)[۶۱] کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابت حدیث کا حکم دیا ہے تو بے جا نہ ہوگا؛ ورنہ کم از کم اجازت تو ضرور ہے۔

ایسے ہی ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بعض حضرات نے پوچھا کہ: آپ کے پاس کچھ احکامات ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھ کر دیے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: کہ میرے پاس اس صحیفہ کے علاوہ اور اس فہم کے علاوہ جو اللہ تعالی نے عطا فرمائی ہے اور کوئی شئی نہیں، اور اس صحیفہ میں زکوۃ، دیات، قصاص، امان وغیرہ کے احکام تھے[۶۲]، اس کے علاوہ بہت سی احادیث اس قسم کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابتِ حدیث کی اجازت دی ہے[۶۳]۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مختلف شاگردوں نے صحائف لکھے،

---

[۶۰] [دیکھیے، ص:۱۸، حاشیہ نمبر:۳۹]

[۶۱] [ابوداود، باب في كتابة العلم، كتاب العلم، رقم الحديث: ۳۶۴۶]

[۶۲] [بخاری، باب كتابة العلم، كتاب العلم، رقم الحديث: ۱۱۱] (یہ حدیث ''بخاری شریف'' میں اور بھی کئی جگہ پر آئی ہے)

[۶۳] مثلاً ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: استعن بیمینک [ترمذی: ۲/۱۰۷] رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے سوال پر فرمایا: اکتبوا ذلک ولا حرج [تدریب الراوی، ص: ۲۸۶ (ص: ۶۳ ج: ۲) والمحدث الفاضل، ص: ۳۶۹] حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: قیدوا العلم بالکتاب [جامع بیان العلم، ص: ۷۲، والمحدث الفاضل، ص: ۳۶۸] دیکھیے: [حُجیتِ حدیث ص: ۱۲۳۔ تدوینِ حدیث ص: ۵۱]

انہی میں سے ایک ''صحیفۂ ہمام بن منبہ'' (۶۴) ہے جس سے امام مسلمؒ اپنی کتاب ''صحیح مسلم'' میں ''ھذا ما حدّثناہ أبو ھریرۃ'' کر کے روایت نقل فرماتے ہیں، انہی مذکورہ احادیث سے اس دوسری جماعت نے اس پر استدلال کیا ہے کہ حدیث کی کتابت جائز ہے (۶۵)۔

(۳): تیسری جماعت نے دونوں قسم کی روایت کو جمع کرنے کے لیے ایک تیسرا مذہب یہ بیان کیا کہ یاد کرنے کے لیے لکھ لے اور جب یاد ہو جائے تو

---

(۶۴) حضرت ہمام بن منبہؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی احادیث کا جو مجموعہ مرتب کیا تھا اس کا نام حاجی خلیفہؒ نے ''کشف الظنون'' میں ''الصحیفۃ الصحیحۃ'' ذکر کیا ہے، امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں اس صحیفہ کو بتمامہا نقل کر دیا ہے، چند سال پہلے اس صحیفہ کا اصل مخطوطہ دریافت ہو گیا ہے، اس کا ایک نسخہ جرمنی میں برلن کے کتب خانہ میں موجود ہے، دوسرا نسخہ دمشق کے کتب خانہ ''مجمع علمی'' میں ہے، سیرت اور تاریخ کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے ان دونوں نسخوں سے مقابلہ کر کے یہ صحیفہ شائع کر دیا ہے، اس میں ایک سو اڑتیس (۱۳۸) احادیث ہیں، اور جب مسند احمد سے اس کا مقابلہ کیا گیا تو کہیں ایک حرف یا ایک نقطہ میں بھی فرق نہیں تھا [درس ترمذی: ۱/ ۴۲]

(۶۵) البتہ اس طریقے سے انفرادی طور پر کسی کسی کو لکھنے کی اجازت دینا یہ اشتباہ کا باعث بھی نہیں تھا، چونکہ ان میں علامت موجود تھی، جیسے شاہانِ عالم کے نام لکھے گئے خطوط جو سیرۃ المصطفی ج: ۲ میں موجود ہیں، قیصرِ روم کے نام نامۂ مبارک ص: ۳۷۷، کسری شاہ ایران کے نام ص: ۳۸۸، نجاشی کے نام: ۳۹۰، مقوقس کے نام ص: ۳۹۴، شاہ بحرین کے نام ص: ۴۰۲، شاہ عمان کے نام ص: ۴۰۵، رئیس یمامہ کے نام ص: ۴۰۹، امیر دمشق کے نام ص: ۴۱۱ پر]

اسی طریقے سے ''کتاب الصدقہ'' یہ ان احادیث کا مجموعہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود املا کرایا تھا، اس میں زکوۃ وصدقات اور عشر وغیرہ کے احکام تھے ''سنن ابی داود'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمال کو بھیجنے کے لیے لکھوائی تھی؛ لیکن ابھی بھجوا نہ سکے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ [درسِ ترمذی: ۱/ ۳۹]

اسی طریقے سے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد دیگر اقوام سے جو معاہدہ ہوا مثلاً ہجرتِ مدینہ کے پانچ ماہ بعد یہودِ مدینہ سے معاہدہ فرمایا، اور چند شرائط پر تحریری عہد لیا [سیرت ابن ہشام: ۱/ ۱۷۸، البدایہ والنہایہ: ۳/ ۲۲۴، بحوالہ سیرۃ المصطفی: ۱/ ۴۵۶]

مٹادے؛ لیکن اب جمہور سلف وخلف کا اجماعی اور متفق علیہ فیصلہ ہے کہ حدیثِ پاک کا لکھنا لکھانا جائز ہے، چنانچہ امام بخاریؒ نے "باب کتابة العلم" کے ذیل میں کتابت کا جواز ثابت فرمایا ہے۔

تیسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ عربوں کے یہاں حفظ کا بڑا اہتمام تھا، چونکہ ان کے حافظے نہایت قوی تھے، اور لاکھوں حدیثیں وہ اپنے اذہان میں محفوظ رکھتے تھے، اس لیے کتابت کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوتی تھی۔

حافظے مضبوط ہونے کی چند وجوہات تھیں:

[۱] اللہ تعالی کا فضل۔

[۲] وہ ناخواندہ تھے، اور ناخواندہ اقوام قلم کے بجائے حافظہ سے زیادہ کام لیتی ہیں۔

[۳] عربوں کے یہاں اشعار، تقاریر، خاندانی انساب؛ یہاں تک کہ جانوروں کے انساب بھی یاد رکھنے کا بڑا اہتمام تھا، جبکہ دیگر اقوام کو یہ بات حاصل نہیں[٢٠]۔

محدثین کا دور تو بہت بعد کا ہے؛ لیکن ان کے حافظے کے واقعات دیکھ کر صحابہؓ وتابعینؒ کے حافظوں کا اندازہ ہوسکتا ہے، ایک دو واقعے مثال کے طور پر عرض ہیں:

امام ترمذیؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ جنگل میں تشریف لے جارہے تھے، ایک جگہ پر خود ہی جھک گئے، شاگردوں نے عرض کیا: حضور! کیوں جھکے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: یہاں کوئی کیکر کا درخت نہیں ہے؟ تلامذہ نے عرض کیا: کہیں

---

[٢٠] [الاعلام للزرکلی: ۲/۱۳۱۔ حجیتِ حدیث ص: ۱۱۰]

نہیں ہے، امام صاحب نے فرمایا کہ: اگر میرا حافظہ اتنا کمزور ہے تو میرا احادیث نقل کرنا ہی ٹھیک نہیں ہے؛ لیکن جب تحقیق کی گئی تو گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے بتلایا کہ یہاں بہت مدت پہلے ایک کیکر کا درخت تھا جواب نہیں رہا، امام ترمذیؒ اخیر زمانہ میں نابینا ہو گئے تھے، بینائی کے زمانہ میں اس جنگل میں کبھی کیکر کے درخت کے نیچے سے گزرے ہوں گے جوان کو اب تک یاد رہا⊙۔

امام زہریؒ کے حافظے کا یہ حال تھا کہ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں مقامِ بقیع (اس جگہ مدینہ کا بازار لگا کرتا تھا) سے گذرتا تو اپنے کان اس خوف سے بند کرلیا کرتا تھا کہ کہیں اس میں بیہودہ باتیں نہ پڑ جائیں، خدا کی قسم ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے کان میں کوئی بات پڑ گئی ہو پھر میں اسے بھول گیا ہوں۔ (جامع بیان العلم ص:۶۹ ج:۱)

ابوزرعہ رازیؒ جو حدیث ورجال کے مشہور ائمہ میں ہیں، فرماتے ہیں کہ: پچاس سال ہوئے جب میں نے حدیثیں لکھیں تھیں اور وہ میرے گھر میں رکھی ہوئی تھیں، لکھنے کے بعد اس پورے پچاس سال کے اندر ان حدیثوں کا میں نے پھر دوبارہ مطالعہ نہیں کیا ہے؛ لیکن جانتا ہوں کہ کونسی حدیث کس کتاب میں ہے، اور اس کتاب کے کس ورق میں ہے، کس صفحہ میں ہے، کس طرح ہے؟ (تہذیب، ص ۲۳، ج ۷)

⊙ امام ترمذیؒ کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے؛ مگر تتبع کے باوجود حوالہ نہ مل سکا، مختلف حضرات واساتذہ کرام سے سنا ضرور ہے۔ (مرغوب)

درسِ ترمذی: ۱/ ۱۳۲، ۱۳۳ پر حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ نے بھی اساتذہ سے سنی ہوئی زبانی روایت ذکر کی ہے۔ (حضرت مفتی) احمد (صاحب خانپوری مدظلہ)

جب اللہ تعالی نے ان کو اتنے زبردست حافظے دیے تھے تو ان کو جمع کر کے تصنیف و تالیف کرنے سے کیا فائدہ ہوتا؟ بلکہ ان کا سینہ خود ایک علم کا خزینہ تھا[٦٩]

[٦٩] یہاں یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ پھر تو قرآن کریم کی بھی کتابت نہ ہونی چاہئے تھی، اس کا جواب واضح ہے کہ:

[۱] قرآن کریم کی کتابت حفاظت کے لئے نہیں تھی، جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں ایک نسخہ بھی مکتوبہ موجود نہیں تھا کہ جس نے مانگا اس کو دے دیا گیا۔

[۲] اسی طریقہ سے دورِ صدیقی میں جمعِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوا تو صرف مکتوب پر اعتماد نہیں ہوا؛ بلکہ حفاظ کے حفظ سے بھی اس کو جوڑا گیا۔

[۳] اسی طریقہ سے قرآن کریم کا رسم الخط توقیفی ہے۔

[۴] ترتیب کو ملحوظ رکھنا مقصود ہے، چونکہ نزول بقدرِ ضرورت مستقل ترتیب سے نہیں ہوا، اور حفظ میں مرتب جماؤ مشکل ہوتا ہے اس لئے دورِ رسالت میں کتابتِ حدیث کا کام نہیں ہوا۔

اسی طریقے سے دورِ صدیقی کے آخری زمانہ میں جب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ مرض الوفات میں تھے تو ان کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خدمت میں حاضر ہوئیں، تو امیر المؤمنین پر اضطرابی کیفیت دیکھی، اور اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ کچھ صحابہؓ کے پاس جو احادیث مکتوبہ شکل میں ہیں اس کی وجہ سے قرآن میں اشتباہ کا خطرہ ہے، اب یہ مکتوبہ احادیث کی کچھ کاپیاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھیں، وہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے منگوا کر اپنے سامنے جلوادیں، اور فرمایا: الآن طابت نفسي. (تدوینِ حدیث: ۲۷۹)

پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو اس کا ابتدائی حصہ فتوحات اور عظیم جنگوں کا ہے، پھر جب سکون میسر آیا تو بہت ساری اصلاحات فرمائیں، ان میں جمع احادیث کا مسئلہ آیا تو شوریٰ طلب کی گئی، جب ایک مرتبہ کی مجلس سے بات صاف نہ ہوسکی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مہینہ تک استخارہ فرمایا، ایک دن عزمِ راسخ کے ساتھ اعلان فرمایا کہ میں نے احادیث کو لکھنے کا ارادہ کیا تھا؛ لیکن اممِ سابقہ کی بات یاد آئی کہ انہوں نے (نبی کی باتوں) کو کتابوں میں لکھا اور اس میں ہمہ تن متوجہ ہوئے، اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔ وانی واللہ لا ألبس كتاب الله بشيء ابداً. (السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي، الفصل الرابع في ثمار هذه الجهود: ۱۲۲)

اس کے بعد دورِ عثمانی جس میں دورِ عمری پر عمل رہا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آخری دور اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت جس میں خانہ جنگی برابر رہی، اس لئے اس فن کی تدوین کی طرف کوئی باضابطہ توجہ نہ ہوسکی۔

ایک اور اشکال

تدوین جب ایک طویل عرصہ بعد ہوئی تو پھر صحیح اور موضوع روایات میں امتیاز کیسے ہوسکتا ہے؟

جواب

اس بات کو سمجھنے کے لیے کچھ تاریخی پس منظر سمجھنا ہوگا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو امت میں چار جماعتیں بنیں:

[۱] اصلی مسلمان: اہل السنت والجماعت۔

[۲] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں غلو کرنے والے۔

[۳] حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرفداری میں غلو کرنے والے۔

[۴] ان دونوں کو صحابی ہی نہ ماننے والے۔

یہ آخری تین گمراہ فرقے سیاسی طور پر وجود پذیر ہوئے، اب ہر باطل فرقہ اپنی تائید میں احادیث کو بیان کرنے لگا، اور وضعِ احادیث کا دروازہ کھل گیا۔ اور یہ نقطۂ انقلاب سن ۴۰ھ میں ہوا، اس وقت امت میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم حیات تھے انہوں نے احادیث کے سلسلہ میں احتیاط شروع کیا، اور جو بھی حدیث شریف بیان کرتا اس سے سند مانگنا شروع کیا، اس سند میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے ان کی تائید بھی ضروری سمجھی گئی، چونکہ دورِ رسالت سے ملحق دور تھا، اس لیے وسائط نہایت کم تھے، معلوم ہوا یہ سند کی بنیاد خود صحابہ ؓ کی ڈالی ہوئی ہے۔

اس طرح صحابہ ﷺ نے جب اپنے دور میں احادیث کے سلسلہ میں رجال اور سند پر زور دینا شروع کیا تو یہی چیز بعد والوں کے لیے بھی ذریعۂ امان بن گئی، واضعین ایک طرف وضع کا کام کرتے تھے دوسری طرف سند کے ذریعہ سے ان کی اس چوری کو پکڑ لیا جاتا، چنانچہ صحاحِ ستہّ اور دوسری کتبِ احادیث میں برابر اسانید کو ذکر کیا جاتا ہے، اور ناقدین حضرات نے رواۃ پر جرح و تعدیل بھی مکمل کر دی ہے، اس لیے اب اس میں خلجان کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہتا۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نقد کا سلسلہ صحابہؓ کے بعد کا ہے، اس لیے کہ صحابہؓ نقلِ حدیث کے مسئلہ میں ''**کلّھم عدول**''[۶۹] ہیں، اور یہ استقرائے تام ہے[۷۰]۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ صحابہؓ کے اخیری دور میں حدیث شریف کی حفاظت اور موضوع احادیث کو صحیح سے الگ کرنے کے لیے تین بنیادی کام ہوئے:

[۱] اسناد۔ [۲] نقدِ رواۃ۔ [۳] توثیقِ اکابر۔

اور یہ تینوں ذرائع باوثوق ہیں اس لیے احادیث پر اعتماد کے سلسلہ میں کوئی وہم نہ کیا جائے۔

---

[۶۹] [تدریب الراوی: ۲/ ۱۹۰ | ''الصحابة کلّھم عدول'' کی تشریح کے لیے دیکھیے: [تدریب الراوی: ۲/ ۱۹۰، ''مقام صحابہ'' از مفتی محمد شفیع صاحبؒ، ص: ۶۵]

[۷۰] استقراء: سے مراد وہ حجت ہے جس میں کسی کلی کے حکم پر اسی کے جزئیات کے احکام سے استدلال کیا گیا ہو۔ استقرائے تام: وہ حجت ہے جس میں کسی کلی پر اس کے تمام جزئیات کے تتبع احوال سے حکم لگایا گیا ہو، یہ یقین کا فائدہ دیتا ہے، مثلاً ہر دیندار امانت دار ہوتا ہے، ہر بخیل دنیا دار ہوتا ہے۔ [معین المنطق، ص: ۸۶، ح ۲، بحث استقراء)

ایک اور اشکال

ایک اور اشکال جو منکرین کی طرف سے کیا جاتا ہے وہ یہ کہ صحابہؓ نے احادیث خود حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی یا کسی دوسرے صحابیؓ سے سنی، اور صحابہؓ روایت کے معاملہ میں ''کلّھم عدول'' ہیں، اب جب تم احادیث کو قانون سازی میں داخل مانتے ہو تو پھر تمام احادیث سے ثابت ہونے والے احکام یکساں ہونے چاہئیں، یہ فرق احکام میں کیوں ہوتا ہے؟

جواب

[۱] تمام کی تمام نصوص باعتبارِ استنباط احکام یکساں درجہ کی نہیں، جیسے قرآن کریم کی [۵۰۰] سے زیادہ آیتیں احکام سے متعلق ہیں؛ لیکن ان تمام آیتوں سے ثابت ہونے والے احکام یکساں نہیں؛ بلکہ اس میں فرق ہوتا ہے، معلوم ہوا قرآن کریم سے ثابت ہونے والے احکام ایک درجہ کے نہیں تو پھر احادیث پر یہ اشکال کیوں؟

[۲] نصوص سے احکام کے استنباط میں قرائن کا خاص لحاظ کیا جاتا ہے، قرائن کی دو قسمیں ہیں:

۱: داخلی قرائن: اسکی دو صورتیں ہیں: ایک تو قرینہ اسی آیت میں ہو، دوسرا کسی دوسری آیت میں قرینہ ہو۔

۲: خارجی قرائن: وہ اصول وضوابط جو اس دور میں اصولِ فقہ کے نام سے

پڑھائے جاتے ہیں۔

اس موقع پر یہ یادرکھنا چاہیے کہ یہ خارجی قرائن صحابہؓ کے لیے نہیں تھے، مثلاً اسانید جوکہ اس وقت حدیث شریف پر اشکال کرنے والوں کے لیے پیٹ کا درد ہے، اگر حقیقت کی نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہ اسانید صرف ایک قرینہ ہے بنیاد نہیں، اس لیے کہ مجتہدین کی نگاہوں میں تلقی بالقبول جس روایت کو حاصل ہوتا ہے وہ قابل قبول ہوتی ہے سند نہیں دیکھی جاتی (۱)۔

حُجّیتِ حدیث

ایک اوراہم اشکال جواس زمانہ میں ہے وہ انکارِحدیث کا مسئلہ ہے، منکرینِ حدیث نامی جوایک گروہ ہے اس کا مطلب لوگوں نے غلط سمجھا، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ گروہ احادیث کا سرے سے انکار کرتا ہے، گویا احادیث نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، منکرینِ حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ وہ احادیث شریفہ کو مانتے تو ہیں؛ لیکن اس کو اسلامی قانون سازی میں بے حیثیت مانتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ احادیث بزرگوں کے اقوال کی طرح تربیت اوراصلاح اخلاق وغیرہ امور کے لیے ہیں قانون سازی کے لیے نہیں؛ لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہے، جس طرح قرآن کریم اسلامی قانون سازی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح احادیث شریفہ کو بھی قانون سازی میں بڑا دخل ہے، اب اس دعوی کے ثبوت کے لیے دلیل کی ضرورت

---

(۱) جیسے "لا وصية لوارث" [فيض القدير شرح جامع الصغير: ۲/ ۹۲۹، رقم الحديث: ۹۹۳۳] والی روایت، اس کے لیے حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ سند ملنا بھی مشکل ہے؛ لیکن مشہور کے درجہ میں پہنچتی ہے۔

پڑتی ہے، اور دلیل کے لیے بہت ساری کتابیں لکھیں گئیں ہیں، ایک دو عام فہم دلیل ذکر کی جاتی ہے۔

[۱] باری تعالی کا پاک ارشاد ہے: ''ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ'' [۱] (پھر ہمارے ہی ذمہ ہے نازل کیے ہوئے قرآن پاک کی وضاحت کرنا) یہاں دو چیزیں ہوئیں ایک مبیّن، دوسرا مبیَّن، مبیِّن جو وضاحت کرے، اور مبیَّن جس کی وضاحت کی جائے، یہ دونوں من کل الوجوہ الگ نہیں صرف اعتباری فرق ہے، (اور یہ جو بیان کرنے والا ہے اسی کو اصطلاح میں ''حدیث'' کہتے ہیں) چونکہ مبیّن بھی منجاب اللہ ہے، توجس طریقہ سے مبیَّن یعنی قرآن کریم قانون ہوا اسی طریقہ سے مبیِّن بھی قانون ہوا، اور قانون سازی میں اس کو بھی دخل ہے، جیسے کہ مرکزی حکومت کوئی قانون بناوے اور صوبائی حکومت اس کی من مانی وضاحت کرنے لگے تو وہ نا قابل قبول ہوگی، اصولی طور پر مرکز سے قانون کے ساتھ جو وضاحت آئی ہے وہ بھی قانون ہی شمار ہوتی ہے، تو اصل متن یعنی قرآن اور اس کی شرح یعنی احادیث شریفہ دونوں کو ملحوظ رکھ کر کے قانون تیار ہوتا ہے۔

[۲] سورۂ نحل میں باری تعالی کا پاک ارشاد ہے وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ'' [۲] اس آیت کریمہ میں بھی دو باتوں کا ذکر ہے، ایک وحیٔ قرآن، اور دوسرا اس کا بیان اور وضاحت، چونکہ

---

[۱] [سورۂ قیمۃ، آیت:۱۹]

[۲] [سورۂ نحل، آیت: ۴۴] (ترجمہ) جو مضامین (آپ کے واسطے سے) لوگوں کے پاس بھیجے گئے ان کو آپ ان سے ظاہر کردیں اور تاکہ وہ (ان میں) فکر کیا کریں۔

قرآن کریم ایک جامع متن ہے، اس کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالی نے اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو بھیجا، اور یہ افہام صرف انسان کے بس میں ہے، مکہ والوں کا بھی یہ اشکال تھا کہ اللہ تعالی نے فرشتہ کو رسول کیوں نہیں بنایا؟ فرشتہ انسانوں کو وہ بات سمجھا نہیں سکتا جو ایک انسان سمجھا سکتا ہے، اب مقصد افہام کے لیے رسول کی زبان پر جو کلمات آتے ہیں وہ بھی اس مقصود میں شامل ہیں اس لیے بیان اور متن دونوں قانون سازی میں مساوی ہوئے۔

نکتہ

''لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ'' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول کا کام بنیادی طور پر ضروری وضاحت کو پیش کرنا ہے، اب رسول جو اصل راہ ڈال کر جاتے ہیں اس پر ہر زمانہ میں ضرورت کے پیشِ نظر مجتہدین غور وفکر کر کے وضاحت کرتے رہیں گے اور وہ بھی قانون اسلامی شمار کیا جائے گا۔

[۳] ''نضر الله امرأ سمع مقالتي فوعاهـا وحفظها وبلّغها فربّ حامل فقه إلى من هو أفقه منه'' ۞ (فوعاها، پہلے زمانہ میں جب بینک نہیں تھے لوگ نقد کو برتن میں بند کر کے چھپا دیتے تھے، اس کو ''سنیتا'' کہا جاتا ہے اور لفظ وعاء اسی مناسبت سے برتن پر بولا جاتا ہے) حدیث شریف میں بتایا گیا کہ ناقل کے مقابلہ میں منقول الیہ زیادہ فقیہ ہوسکتا ہے، معلوم ہوا زبانِ رسالت نے یہ اعلان فرمایا کہ ان احادیث میں فقہ ہے، اور فقہ قانونِ اسلامی ہی کا نام

۞ [ترمذی، باب ما جاء في الحث على تبليغ السماع، أبواب العلم، رقم الحديث: ۲۶۵۸، ابوداود، باب فضل نشر العلم، كتاب العلم، رقم الحديث: ۳۶۶۰]

ہے، تو قرآن کی طرح احادیث شریفہ کو قانون کا مصدر خود زبانِ رسالت نے فرمایا ہے۔

(۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: "ألا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ" الخ ①۔ یعنی میں قرآن دیا گیا اور قرآن کریم کے مانند بھی دیا گیا، اور وہ یہ احادیث شریفہ ہی ہیں۔ اور یہ مثلیت تعداد میں نہیں؛ بلکہ حجیت میں ہے، چونکہ قرآن میں نماز کا اجمالی حکم ہے اس کی تفاصیل احادیثِ شریفہ میں ہیں، اور نماز انہیں تفاصیل کی رعایت کے ساتھ صحیح ادا ہوتی ہے، معلوم ہوا حدیث قانون سازی میں حجت ہے۔

مدوّنِ اوّل

سب سے پہلے کس نے اس فن کو مدوّن اور مبوب کیا؟

ائمۂ محدثین ومؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ سب سے پہلے حدیث کے مدون امام ابن شہاب زہریؒ ہیں ② ان کی وفات ۱۲۵ھ میں ہوئی ہے، اور بعض

① [ابوداود، باب في لزوم السنة، كتاب السنة، رقم الحديث: ۴۶۰۴]

② ابن شہاب زہریؒ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ آمنہؓ کے قبیلۂ بنی زہرہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے ان کو زہری کہا جاتا ہے، اور ان کے جد امجد شہاب بہت مشہور آدمی تھے اس لئے ان کی طرف نسبت کرکے ان کو ابن شہاب کہتے ہیں [تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۰۸۔ تہذیب الکمال: ۲۶/ ۴۱۹۔ فتح الباری: ۱/ ۲۲] حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے: اتفقوا علی اتقانه و امامته، عمر بن عبد العزیزؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: لم یبق أحد أعلم بسنة ماضية من الزهري، اور لیث بن سعد کا قول ہے: ما رأيت عالما قط أجمع من الزهري و ان حدث عن القرآن و السنة فكذلك "میں نے کسی عالم کو زہری جیسی جامعیت کا حامل نہیں دیکھا، اور قرآن وحدیث کو بیان کرنے والا ان سے بہتر کوئی نہیں پایا"۔ یہی ابن شہاب زہریؒ "أول من دوّن الحديث" کے مصداق ہیں، ←

محدثین ومؤرخین کی رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے مدوّن ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم ہیں (۲) اوران کی وفات ۱۲۰ھ میں ہے، جولوگ ان کو ترجیح دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت امام بخاریؒ نے ''باب کیف یقبض العلم'' (۳) کے ذیل میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا جو خط نقل کیا ہے اس میں انہیں کا نام مذکور ہے، اور ''موطأ امام محمد'' (۴) میں ہے کہ ان کو حکم فرمایا گیا؛ لیکن ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، پہلے معلوم ہوگیا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے امرائے اجناد کو خطوط لکھ کر جمع حدیث کا حکم فرمایا تھا (۵) تو بہت ممکن ہے کہ ایک امیر نے ابوبکر بن حزمؒ کو اور دوسرے نے ابن شہاب زہریؒ کو حکم دیا ہو، زمانہ دونوں کا تقریباً ایک ہی ہے۔

---

(۱) حافظ ابن حجرؒ نے "باب کتابة العلم" میں انہی کو مدونِ اول قرار دیا ہے [فتح الباری: ۱/ ۲۰۸] اسی طرح ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں امام مالکؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مدون اول ابن شہاب زہری ہیں [حلیۃ الأولیاء: ۳/ ۳۶۳۔ نفحات التنقیح: ۱/ ۲۷]

(۲) ابوبکر بن حزم یہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرف سے مدینۂ منورہ کے گورنر تھے، عالم، فاضل، متقی، عابد اور شب زندہ دار تھے، ان کی اہلیہ کا بیان ہے کہ یہ چالیس سال تک کبھی رات کو بستر پر نہیں لیٹے، امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ مدینۂ منورہ میں ان سے زیادہ کسی کو قضا کا علم نہیں تھا [تہذیب الکمال: ۲۳/ ۱۳۷]

(۳) کتب عمر بن عبدالعزیز الی ابی بکر بن حزم: انظر ما کان من حدیث رسول اللہﷺ فاکتبہ فانی خفت ذھاب العلم و ذھاب العلماء [بخاری: ۱/ ۲۰]

(۴) [موطأ امام محمد: ۳/ ۴۶۰، باب اکتتاب العلم، أبواب السیر]

(۵) حافظ ابن حجرؒ نے ابونعیم اصفہانی کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ کتب عمر بن عبدالعزیز إلی الآفاق انظروا حدیث رسول اللہﷺ فاجمعوہ۔ [فتح الباری: ۱/ ۱۹۵] حافظ ابوعمرو بن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم'' [۱/ ۷۵] میں نقل کیا ہے: یحدث سعد بن ابراھیم: أمرنا عمر بن عبد العزیز بجمع السنن [نفحات التنقیح: ۱/ ۲۸]

بہر حال! یہ دونوں نام تو علی العموم ملتے ہیں؛ لیکن تاریخ میں اس کے علاوہ اور بھی دوسرے حضرات کے متعلق لکھا ہوا ہے کہ یہ اول مدوّن ہیں، مثلاً امام مالک، معمر، ابن جریج، ابن مبارک، ہیثم وغیرہ ان سب کے تراجم میں ملے گا کہ یہ لوگ مدوّنِ اول ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں تار برقی، ڈاک وغیرہ کا یہ سلسلہ تو تھا نہیں جواب ہے، نہ ریل تھی، نہ ہوائی جہاز، موٹریں وغیرہ؛ بلکہ دستور یہ تھا کہ اگر کسی کو اپنے کسی عزیز کا حال معلوم کرنا ہوتا یا سلام و خیریت وغیرہ کہلانی ہوتی تو جو قافلہ کسی غرض سے اس طرف جاتا یا کوئی ملنے کے واسطے آیا ہوتا اور وہ واپس جاتا یا حج کر کے لوگ واپس جاتے تو ان کے ساتھ ایک پرچہ دے دیا کرتے تھے، جب وہ اس مقام پر پہنچتا تو تلاش کر کے دیا کرتا، اس میں بسا اوقات ایک دو سال بھی لگ جایا کرتے تھے، غرض کہ ہر ایک کو اپنے سے دور رہنے والے کا حال چونکہ بالکل معلوم نہ ہوتا تھا اس لیے جب بھی کوئی کتاب حدیث کی کسی طرح دوسری جگہ پہنچتی تو وہ سمجھتے تھے کہ یہی شخص اول مدوّن ہوگا، اس لیے کہ ان کو اس کی خبر ہی نہیں ہوا کرتی تھی کہ اس سے پہلے بھی ایک اور کتاب تصنیف کی جا چکی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے تو کتابی شکل میں جمع کیا اور پھر جوں جوں زمانہ گذرا تہذیب و تنقیح و تبویب ہوتی چلی گئی اور اس فن میں جلا پیدا ہوتا گیا، اور دوسرے محدثین نے ہر باب کی احادیث الگ الگ جمع کر دیں، مثلاً زکوۃ کی ''کتاب الزکوۃ'' میں اور نماز کے متعلق روایات ''کتاب الصلوۃ'' میں وغیرہ وغیرہ۔

علامہ سیوطیؒ نے علم حدیث میں ایک الفیہ لکھا ہے جو ''الفیۂ سیوطی'' کے نام

سے مشہور ہے (اس کو الفیہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں ہزار اشعار ہیں) اس میں ان حضرات کے اسمائے گرامی بیان فرمائے ہیں جن کو اول مدوّن کہا گیا ہے، اور چونکہ امام بخاریؒ کو بھی اول جامع کہا جاتا ہے، اس وجہ ان کا نام بھی مذکور ہے وہ اشعار یہ ہیں:

اَوَّلُ جَامِعِ الْحَدِيْثِ وَالْأَثَر — اِبْنُ شَهَابٍ اَمَرَ لَهُ عُمَرُ

وَاَوَّلُ الْجَامِعِ لِلْاَبْوَابِ — جَمَاعَةٌ فِي الْعَصْرِ ذُوْ اِقْتِرَابِ

كَابْنِ جُرَيْجٍ وَهُشَيْمٍ وَمَالِكِ — وَمَعْمَرٍ وَوَلَدِ الْمُبَارَكِ

وَاَوَّلُ الْجَامِعِ بِاِقْتِصَارِ — عَلَى الصَّحِيْحِ فَقَطْ اَلْبُخَارِي

وَمُسْلِمٌ بَعْدَهُ وَالْاَوَّلُ — عَلَى الصَّحِيْحِ فِي الصَّحِيْحِ اَفْضَلُ

عمر سے مراد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں، ان اشعار میں سیوطیؒ نے اول مدون ابن شہاب زہریؒ کو بتلایا ہے، اب چونکہ یہ اعتراض رہ جاتا ہے کہ امام زہریؒ کے علاوہ امام مالکؒ وغیرہ کو بھی تو اول مدون کہا گیا ہے، تو علامہ ان دونوں میں جمع کرتے ہوئے فرماتے ہیں: واول الجامع الخ یعنی امام مالکؒ وغیرہ پر جو اول جامع کا اطلاق کیا گیا ہے وہ اس حیثیت سے ہے کہ ان حضرات نے سب سے پہلے ابواب پر احادیث کو مرتب کیا، جمہور کا یہی جواب ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں:

وَاَوَّلُ الْجَامِعِ بِاِقْتِصَار — عَلَى الصَّحِيْحِ فَقَطْ اَلْبُخَارِي [۹۱]

---

[۹۱] [مقدمہ اوجز: ۱/ ۱۸]

چونکہ امام بخاریؒ پر بھی اول جامع کا اطلاق ہے اس لیے علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ امام پر اول جامع کا اطلاق اس حیثیت سے ہے کہ انہوں نے احادیثِ صحیحہ مجردہ کو سب سے پہلے جمع کیا۔

تیسری وجہ اس تعارض کی حافظ ابنِ حجرؒ نے ارشاد فرمائی ہے کہ یہ اوّلیت باعتبار بلاد کے ہے مثلاً مدینۂ طیبہ میں امام مالکؒ، بصرہ میں ابنِ جریحؒ اور رے (ایران) میں عبداللہ بن مبارکؒ، یمن میں معمر بن راشدؒ سب سے اول احادیث کو جمع کرنے والے ہیں۔

امرِ سادس: اجناس

علوم کی اجناس مقرر ہیں، اور مقرر ہونے کا مطلب یہ ہے کی علم کی تقسیم مختلف حیثیات واحوال کے ساتھ کی گئی ہے، مثلاً ایک تقسیم علم کی باعتبارِ عقلیات و نقلیات کے ہے، کہ آیا یہ علم عقلی ہے یا نقلی، جیسے منطق وفلسفہ عقلی ہیں، اور جغرافیہ تاریخ وغیرہ نقلی، اس معنی کے اعتبار سے علمِ حدیث کی جنس نقلی ہے۔

ایک تقسیم علوم کی اصلی وآلی ہونے کے اعتبار سے ہے کہ آیا یہ علم مقصود اصلی ہے یا دوسرے کسی علم کے لیے آلہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس اعتبار سے علمِ حدیث کی جنس اصلی ہے۔

ایک تقسیم علوم کی شرعی وغیر شرعی ہونے کے اعتبار سے ہے، اس اعتبار سے علم حدیث کی جنس شرعی ہوئی، تو اب خلاصہ یہ نکلا کہ علمِ حدیث کی جنس نقلی، اصلی، شرعی ہوئی۔

علماء نے اس سلسلہ میں متعدد کتابیں لکھی ہیں، مثلاً ''کشف الظنون عن الاسامي الكتب والفنون'' اس میں اصلی تذکرہ تو کتابوں کا ہے؛ مگر تبعًا اجناس پر بھی بحث کی گئی ہے، اور نواب صدیق حسن خان قنوجیؒ کی ''ابجد العلوم'' اور مولانا محمد اعلی تھانویؒ محدث کی کتاب ''کشّاف اصطلاحاتِ الفنون'' وغیرہ، اس فن میں سب سے جامع کتاب یہی ''کشّاف'' ہے۔

امرِ سابع: مرتبۂ حدیث

علمِ حدیث کا مرتبہ دو اعتبار سے ہے: ایک باعتبارِ فضیلت، دوسرا باعتبارِ تعلیم، فضیلت کے اعتبار سے تو یہ دوسرے نمبر پر ہے؛ کیونکہ اول نمبر پر قرآن پاک ہے، اور تعلیمی حیثیت سے اس کا مرتبہ سب علوم سے آخر میں ہے، جیسا تم بھی دیکھتے ہو کہ ہر درسِ نظامی میں دورۂ حدیث شریف کو جملہ کتب کے اخیر میں رکھا گیا ہے، سب سے پہلے نحو وصرف اور دوسرے علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، کیونکہ یہ سب علوم آلیہ ہیں، اور آلہ کے درجہ میں ہیں، اور آلہ مقدم ہوا کرتا ہے اور اصل مقصد مؤخر۔

امرِ ثامن: قسمت وتبویب

جس طرح کتابوں کے اندر تقسیم وتبویب ہوتی ہے ایسے ہی علم کی بھی تقسیم وتبویب ہوتی ہے، چنانچہ حدیث کے آٹھ ابواب ہیں، یعنی ہر حدیث کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان آٹھ ابواب میں سے کسی ایک باب میں داخل ہو، وہ آٹھ یہ ہیں:

[۱] عقائد۔[۲] احکام۔[۳] تفسیر۔[۴] تاریخ۔

[۵] رقاق۔[٦] آداب۔[۷] مناقب۔[۸] فتن۔

جو کتاب ان آٹھوں ابواب کو مشتمل ہو اس کو ''جامع'' کہتے ہیں ''بخاری شریف'' جامع ہے۔

نیز ان اقسامِ ثمانیہ میں مستقل الگ الگ تصانیف بھی ہیں، مثلاً امام بیہقیؒ کی کتاب ''الاسماء والصفات'' اس میں بیہقیؒ نے احادیث عقائد کو جمع کیا ہے، اور عبداللہ بن مبارکؒ کی ''کتاب الزھد والرقائق'' وغیرہ، ''ترمذی'' کے متعلق اختلاف ہے کہ وہ کونسی قسم میں داخل ہے، اس کے اندر اگرچہ ابوابِ ثمانیہ موجود ہیں؛ مگر اس کی ترتیب فقہی انداز پر ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کو ''کتاب الطھارۃ'' سے شروع فرمایا نہ کہ ''کتاب الایمان'' سے، جن لوگوں نے آٹھوں ابواب کا خیال کیا انہوں نے اس کو جامع بتلایا، اور بعض لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ اس کی تالیف برطریق سنن ہے اس کو ''سننِ ترمذی'' بتلایا۔

امرِ تاسع: حکمِ شرعی

علمِ حدیث کا حکمِ شرعی یہ ہے کہ جس مقام پر صرف ایک مسلمان ہو وہاں حدیث کا پڑھنا فرضِ عین ہے، اور اگر بہت سے مسلمان ہوں تو پھر فرضِ کفایہ ہے، یہی حکم علمِ فقہ کا ہے؛ کیونکہ احادیث کی تفصیل وتبیین فقہ پر ہی موقوف ہے، رؤسِ ثمانیہ اور اس کے متعلقات کی بحث پوری ہوئی۔

دوسرا باب

انواعِ کتب حدیث

انواعِ کتبِ حدیث

علم کی اجناس ہوتی ہیں، اور کتاب کی انواع بیان کی جاتی ہیں، انواعِ کتبِ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ محدثینِ کرام نے نہایت جانفشانی سے اپنی کتابوں کو لکھنے میں جو ایک خاص اسلوب اور جدت اختیار کی ہے، اور طرح طرح کی گلکاریاں کی ہیں اور مختلف طریقوں سے احادیث جمع کی ہیں وہ کس طرح سے ہیں اور کیسی ہیں؟

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنی کتاب ''عجالۂ نافعہ'' میں چھ قسمیں بیان فرمائی ہیں [۹۲]۔

جس میں انہوں نے جوامع وسنن کو ایک شمار فرما کر اس طرح تقسیم فرمائی ہے، جوامع، مسانید، معجم، اجزا و رسائل، اربعینات؛ لیکن سیدی حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے ''مقدمۂ لامع الدراری'' میں انتیس [۲۹] قسمیں بیان فرمائی ہیں [۹۳]۔

---

[۹۲] [عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ، ص:۵۱]

[۹۳] [مقدمۂ لامع الدراری: ۱/ از ص: ۱۴۲ تا ۲۰۴]

پہلی قسم: جوامع

جامع: اس کتاب کو کہتے ہیں جو علمِ حدیث کے ابوابِ ثمانیہ کو جامع ہو[۹۰]
یعنی [۱]: عقائد [۲]: احکام [۳]: تفسیر [۴]: تاریخ [۵]: آداب
[۶]: رقاق [۷]: مناقب [۸]: فتن[۹۱]

''بخاری'' اور ''ترمذی'' جامع ہیں؛ کیونکہ ان میں یہ آٹھوں ابواب موجود ہیں؛ لیکن ''ترمذی'' کو ''سننِ ترمذی'' بھی کہہ سکتے ہیں؛ کیونکہ وہ ابوابِ فقہیہ کی ترتیب پر ہے؛ البتہ ''مسلم شریف'' میں اختلاف ہے کہ آیا وہ جامع ہے یا نہیں، کیونکہ ''باب التفسیر'' اس میں بہت مختصر ہے، جن لوگوں نے اس کو بھی جامع کہا ہے تو وہ صرف اس بنا پر کہ مختصراً ہی سہی تفسیر کا باب موجود تو ہے، اور دوسرے لوگوں نے مختصر ہونے کی وجہ سے اس کا اعتبار نہیں کیا؛ لیکن محدثین اس پر جامع کا اطلاق کرتے ہیں[۹۲]۔

---

(۹۰) علامہ کشمیریؒ نے ان مضامین کو اس شعر میں جمع کر دیا ہے:

سیر، آداب، تفسیر، و عقائد ۔۔۔ فتن، احکام، اشراط و مناقب

(۹۱) سِیَر، سیرت کی جمع ہے، یعنی وہ مضامین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ آداب، ادب کی جمع ہے، مراد ہے آداب المعاشرت، مثلاً کھانے پینے کے آداب۔ تفسیر، یعنی وہ احادیث جو تفسیر قرآن سے متعلق ہیں۔ عقائد: وہ احادیث یا مضامین جن کا تعلق عقائد سے ہیں۔ فتن، فتنۃ کی جمع ہے، یعنی وہ بڑے بڑے واقعات جن کی پیشین گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی۔ اشراط، یعنی علامات قیامت۔ احکام، یعنی احکام عملیہ جن پر فقہ مشتمل ہوتا ہے۔ مناقب، منقبت کی جمع ہے، یعنی صحابۂ کرامؓ اور صحابیاتؓ اور مختلف قبائل اور طبقات کے فضائل [درسِ ترمذی: ۱/ ۵۰]

رِقاق: رَقیق کی جمع ہے، مراد وہ احادیث جن سے دل نرم ہو اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو۔

(۹۲) شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ''صحیح مسلم'' کو جامع میں تسلیم نہیں کیا؛ مگر دوسرے محدثینؒ مثلاً شیخ مجدالدین فیروز آبادیؒ، حاجی خلیفہؒ، ملا علی قاریؒ، نواب صدیق حسن خان صاحبؒ، ←

دوسری قسم: سنن (۹۰)

سنن: اس کتاب کو کہتے ہیں جس کے ابواب فقہی طریقہ سے ہوں (۹۱) اور جس میں صرف احکام کی احادیث ہوں جیسے سننِ ابی داود، سننِ نسائی، سننِ ابن ماجہ، سننِ دارقطنی، سننِ بیہقی، وغیرہ (۹۲)۔

تیسری قسم: مسند (۵۰)

مسند: اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں صحابی کی ترتیب پر احادیث کو جمع کیا گیا ہو کہ ہر صحابی کی تمام روایات کو ایک جگہ جمع کیا جاوے خواہ وہ کسی

⬅ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہ نے اسے جوامع میں شمار کیا ہے [فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ: ۱۵۶، و ۱۵۷] سب سے پہلی جامع ''جامع معمر بن راشد'' ہے، جو امام زہریؒ کے شاگرد حضرت معمرؒ کی تالیف ہے، اور پہلی صدی ہجری ہی میں مرتب ہو چکی تھی، لیکن اب نایاب ہے۔ دوسری ''جامع سفیان ثوری'' ہے، اس سے امام شافعیؒ نے بھی استفادہ کیا، یہ بھی نایاب ہے۔ تیسری ''جامع عبد الرزاق'' ہے جو امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانیؒ (متوفی ۲۱۱ھ) کی تالیف ہے، اور دوسری صدی ہجری میں معروف ہو چکی تھی، یہ ''مصنف عبد الرزاق'' کے نام سے مشہور ہے، اور حال ہی میں (سنہ ۱۹۷۰ء سنہ ۱۳۹۰ھ سے سنہ ۱۹۷۲ء سنہ ۱۳۹۲ھ کے درمیان علامہ حبیب الرحمن اعظمیؒ کی تحقیق سے) گیارہ (ضخیم) جلدوں میں (خوبصورت ٹائپ سے اعلیٰ کاغذ پر دار القلم بیروت سے چھپ کر مجلس علمی ڈابھیل، سملک) سے شائع ہو چکی ہے۔ ''جامع دارمی'' بھی مشہور جوامع میں داخل ہے؛ لیکن سب سے زیادہ مقبولیت ''جامع بخاری'' کو حاصل ہوئی ہے اس کے بعد ''جامع ترمذی'' کو [درسِ ترمذی: ۱/ ۵۰]

(۹۰) ''سنن'' کو ابتدا میں ''ابواب'' کہتے تھے، بعد میں اس کا نام تبدیل ہو کر ''مصنَّف'' ہو گیا، اور آخر میں اس کو ''سنن'' کہا جانے لگا۔ سنن میں سب سے پہلی کتاب امام ابو حنیفہؒ کے استاذ حضرت عامر بن شراحیل الشعبیؒ نے لکھی، جو ''ابواب الشعبی'' کے نام سے مشہور ہے۔

(۹۱) [الرسالة المستطرفة ص: ۲۹]

(۹۲) صحاح ستہ میں نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ سنن ہیں، چنانچہ ''سنن اربعہ'' کا لفظ بول کر یہی چار کتب مراد لی جاتی ہیں، سنن اربعہ کے علاوہ سنن بیہقی، سنن دارمی، سنن دارقطنی ⬅

مسئلہ سے متعلق ہوں؛ لیکن اس کی ترتیب مختلف طریقوں سے ہوتی ہے، بعض تو افضل کو مقدم کرتے ہیں، اس صورت میں پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مرویات، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مرویات ہوں گی، اور بعض حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیتے ہیں اس میں بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پہلے ہوں گے: مگر اس لیے کہ ان کے نام میں پہلے الف ہے، اسی طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی حرف الالف میں ہوں گے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نمبر حرف العین میں ہوگا۔ اور بعض تقدم اسلام کے اعتبار سے ترتیب دیتے ہیں (۹۱) یعنی جو متقدم فی الاسلام ہو اس کی روایت کو پہلے جمع کریں گے خواہ وہ مرتبہ میں کم ہو یا زیادہ، بعض نے مراتب صحابہ کے اعتبار سے ترتیب دی ہے، یعنی پہلے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، پھر اصحاب بیعت رضوان رضی اللہ عنہم وعلی ہذا القیاس (۹۲) بعض نے قبائل کے اعتبار سے ترتیب دی ہے جس میں پہلے بنو ہاشم کی مرویات کو ذکر کیا ہے خصوصاً حضرت علی وحضرت حسن وحضرت حسین رضی اللہ عنہم، اس کے بعد ہر وہ قبیلہ جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریبی تعلق ورشتہ رکھتا ہو، اس اعتبار سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی احادیث کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی احادیث سے

اور سنن سعید بن منصور اس نوع کی مشہور کتابیں ہیں، ان کے علاوہ سنن ابن جریج اور سنن وکیع بن الجراح اس نوع کی قدیم کتابیں ہیں؛ نیز مصنف عبد الرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ بھی اس نوع میں شامل ہیں، بعض حضرات مکحول کی کتاب السنن کو بھی اسی میں شمار کرتے ہیں۔ [درسِ ترمذی: ۱/ ۵۱]

(۹۰) سب سے پہلی مسند حضرت نعیم بن حمادؒ نے لکھی۔

(۹۱) لیکن ایسی تصانیف مفقود ہیں جن میں تقدم فی الاسلام کا اعتبار کیا گیا ہو [نفحات: ۱/ ۱۶]

(۹۲) مثلاً خلفائے راشدین کے بعد عشرۂ مبشرہ، پھر بدریینؓ، پھر شرکائے بیعت رضوانؓ، پھر اہل حدیبیہ، پھر فتح مکہ سے پہلے ہجرت کرنے والے، پھر جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے، پھر صغار صحابہؓ، ان کے بعد عورتیں، لیکن عورتوں میں ازواج مطہراتؓ کی حدیثوں کو مقدم کیا جائے گا؛

پہلے لائیں گے (۹۳)۔

پہلے زمانہ میں مسانید لکھنے کا بہت دستور تھا، اور اکثر اکابر نے مسانید لکھی ہیں، مثلاً مسندِ امام احمد ابن حنبل (۹۴)، مسندِ ابی داود طیالسی، مسندِ ابن ابی شیبہ، مسندِ حمیدی، مسندِ بزار، وغیرہ (۹۵)۔

چوتھی قسم: معجم (۹۶)

معجم: وہ کتاب ہے جس میں شیوخ کی ترتیب پر روایات کو جمع کیا جائے چاہے اس میں شیخ کی وفات کے تقدم کا اعتبار ہو یا شیخ کے علم وفضل کا، یا حروف تہجی کا جیسے ''معاجمِ ثلاثہ طبرانی'' (معجمِ کبیر، معجمِ اوسط، معجمِ صغیر)

پانچویں قسم: مشیخات

مشیخہ: کسی بھی استاذ یا شیخ کی روایات کو یکجا جمع کر دینا خواہ وہ کسی بھی مسئلہ سے متعلق ہو، مثلاً مشیخہ ابن البخاری، مشیخہ ابن شاذان، مشیخہ ابن القاری، وغیرہ (۹۷)۔

اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سے تین صاحبزادیوں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ سے کوئی روایت منقول نہیں، اور حضرت فاطمہؓ سے کچھ (۱۸) [سیر الصحابہ: ۶/ ۱۰۶] روایتیں منقول ہیں؛ لیکن وہ بہت کم ہیں [عجالہٴ نافعہ، ص:۴۹]

(۹۳) کیونکہ حضرت عثمانؓ قبیلہٴ بنی امیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے قبیلوں کی بنسبت بنو ہاشم سے زیادہ قریب ہے [مقدمہٴ لامع الدراری: ۱/ ۱۴۶] اور حضرت ابوبکرؓ کی احادیث حضرت عمرؓ کی حدیثوں پر مقدم ہوں گی [عجالہ، ص:۵۰، نفحات ۱:۱۶]

(۹۴) مسانید میں ''مسند امام احمد بن حنبل'' سب سے زیادہ مشہور اور نہایت جامع ومتداول ہے۔

(۹۵) یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کبھی حدیث کی کتاب پر ''مسند'' کا اطلاق اس لئے۔

حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ

ⓔ بھی کر دیا جاتا ہے کہ اس میں احادیث ابواب فقہیہ کی ترتیب پر ہوتی ہیں یا اس کی ترتیب حروف وکلمات پر ہوتی ہے اور اس میں ہر حدیث کی سند حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مذکور ہوتی ہے، چونکہ وہ مسند اور مرفوع حدیثوں کا مجموعہ ہوتا ہے اس لئے اس کو مسند کہہ دیتے ہیں، بخاری اور مسلم کو مسند اسی لئے کہا گیا ہے، دارمی کو بھی مسند کہتے ہیں حالانکہ اس میں مرسل، منقطع اور معضل سب طرح کی احادیث ہیں؛ مگر مرفوعات کا ذخیرہ زیادہ ہے، (لیکن مسند کی یہ اصطلاح مشہور نہیں ہے) واضح رہے مسند جس طرح اسمائے صحابہؓ پر حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہوتی ہے اگر ابواب فقہیہ پر بھی مرتب ہو تو ایسی کتاب بیک وقت مسند بھی کہلاتی ہے اور مصنف وسنن بھی، گو ایسی کتابیں بہت کم لکھی گئیں، شیخ الاسلام ابوعبدالرحمن بقی بن مخلدؒ اندلسی التوفی ۲۷۶ھ، کی کتاب ''مصنف کبیر'' جس کو مصنفؒ نے صحابہؓ کے ناموں پر مرتب کیا، اس میں ایک ہزار تین سو سے زائد صحابہؓ سے روایت کی ہے، پھر ہر صحابی کی حدیث کو عنوانات فقہ اور ابواب احکام پر مرتب کیا ہے، جس کی وجہ سے وہ مسند ومصنف بن گئی [عجالہ نافعہ، ص:۱۵۹]

ⓔ معجم کی یہ تعریف مشہور ہے کہ شیوخ کی ترتیب پر روایات جمع کی ہوں؛ مگر حضرت شیخ فرماتے ہیں یہ تعریف صحیح نہیں، معجم وہ ہے جس میں حروف تہجی کی ترتیب پر احادیث کو جمع کیا گیا ہو، خواہ یہ ترتیب صحابۂ کرامؓ میں ہو یا شیوخ میں، اس نوع کی متعدد کتابیں مشہور ہیں، مثلاً معجم اسماعیلی، معجم ابن الغوطی؛ لیکن سب سے زیادہ مشہور امام طبرانیؒ کی معاجم ہیں، انہوں نے تین معاجم لکھی ہیں، ایک ''المعجم الکبیر'' جس میں صحابہ کرامؓ کی ترتیب سے احادیث جمع کی ہیں۔ معجم کبیر کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ صحابہ کی ترتیب پر ہے یا مشائخ کی، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ''بستان المحدثین'' ص:۱۳۷ [اردو، ص:۸۷] میں اور حاجی خلیفہ نے ''کشف الظنون'' ص:۱۷۳۷، ج:۲، میں اسے صحابہؓ کی ترتیب پر قرار دیا ہے؛ البتہ ''عجالہ نافعہ'' میں اسے مشائخ کی ترتیب پر قرار دیا ہے، حضرت شیخ فرماتے ہیں میں نے ۱۳۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں ''معجم کبیر'' کا نسخہ دیکھا اس کی ترتیب مشائخ کے اعتبار سے تھی [نفحات:۱/۱۷] علامہ شامیؒ فرماتے ہیں ''معجم کبیر'' اسمائے صحابہ پر حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہے، بیان کیا گیا ہے کہ اس میں ساٹھ ہزار حدیثیں ہیں، اور یہ بارہ جلدوں میں ہے، اس کے متعلق ابن دحیہ کا بیان ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی مسند ہے۔ دوسری ''المعجم الاوسط'' جس میں شیوخ کی ترتیب سے احادیث جمع کی گئی ہیں، تیسری ''المعجم الصغیر'' جس میں امام طبرانیؒ نے اپنے شیوخ میں سے ہر ایک کی ایک ایک حدیث ذکر کی ہے، پہلی دو کتابیں نایاب ہیں؛ البتہ ان کی احادیث علامہ ہیثمیؒ کی ''مجمع الزوائد'' میں مل جاتی ہیں، تیسری شائع ہو چکی ہے۔ [عجالہ، ص ۱۶۲، درس ترمذی:۱/۵۲]

ⓔ [لامع الدراری: ص:۱۵۰ و ۱۵۱]

چھٹی قسم: اجزا و رسائل

اجزا: وہ ہیں جن میں کسی خاص استاذ کی روایات کو ذکر کردیا جائے، جیسے جزء حدیث ابی بکر، جزء حدیث مالک۔ اور رسائل: وہ ہیں جن میں کسی خاص مسئلہ وموضوع کے متعلق روایات کو جمع کیا گیا ہوں [۹۸]۔

ان اجزا و رسائل کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے الگ الگ دو قسمیں شمار کی ہیں [۹۹]؛ مگر میرے نزدیک دونوں ایک ہیں، متقدمین جس چیز کو اجزا سے تعبیر کرتے تھے متاخرین نے اس کو رسائل سے تعبیر کیا، چنانچہ امام سیوطیؒ بکثرت جزء پر رسالہ کا اطلاق کرتے ہیں، اور اس قول کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ امام بخاریؒ کا ''جزءِ رفع الیدین'' مشہور ہے، حالانکہ وہ ایک مسئلہ کے متعلق ہے؛ اور شاہ صاحبؒ کے قول کے مطابق اس کو رسالہ کہنا چاہئے [۱۰۰]۔

ساتویں قسم: اربعینہ

اربعینہ جس کو ہمارے یہاں ''چہل حدیث'' کہتے ہیں، اس کے متعلق ایک حدیث مشہور ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من حفظ علی امتي أربعين حديثا من أمر دينها بعثه الله تعالى يوم القيامة في زمرة الفقهاء والعلماء، وفي رواية أبي الدرداء رضي الله عنه كنت له يوم القيامة

---

[۹۸] [لامع الدراری، ص:۱۵۲]

[۹۹] [عجالہ نافعہ، ص:۵۰]

[۱۰۰] [تقریر بخاری شریف، از حضرت شیخ ۱:۴۷]

شافعا وشهيدا، وفي رواية ابن مسعود رضی اللہ عنہ قيل له: أدخل من أي أبواب الجنة شئت.'' یعنی جو شخص میری امت کے لیے اس کے امرِ دین کے متعلق چالیس حدیثیں محفوظ کر لے اللہ تعالی اس کو قیامت کے دن فقہا اور علما کے ساتھ اٹھائیں گے، اور ابو درداء رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ میں قیامت کے دن اس کا سفارشی اور گواہ بنوں گا، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اس کو کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے تو چاہے داخل ہو جا [۱۰۱]۔

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے [۱۰۲] لیکن تمام علماء حدیث (محدثین) نے چہل حدیث لکھیں ہیں، اس سلسلہ میں سب سے پہلے لکھنے والے عبداللہ بن مبارکؒ ہیں [۱۰۳] کوئی محدث ایسا نہیں جس نے چہل حدیث نہ لکھی ہو، حضرت شاہ ولی

---

[۱۰۱] [شعب الایمان للبیهقي، ص: ۲۷۰ و ۲۷۱، باب فی طلب العلم، فصل فی فضل العلم وشرف مقداره، رقم الحديث: ۱۷۲۶ و ۱۷۲۷۔ مشکاۃ: ۱/ ۳۶، کتاب العلم، الفصل الثالث]

[۱۰۲] امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: ''هذا متن مشهور فيما بين الناس وليس له اسناد صحيح [بیہقی، مشکوۃ، حوالۂ بالا] حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث تیرہ صحابۂ کرامؓ سے منقول ہے؛ لیکن اس کی کوئی سند علت قادحہ سے محفوظ نہیں [تلخیص الحبیر: ۱/ ۹۳ کتاب الوصایا، رقم: ۱۳۷۵] امام نوویؒ کا قول ہے: واتفق الحفاظ على أنه حديث ضعيف وإن كثرت طرقه. [الاربعین النوویہ، ص: ۵] صاحبِ کشف الظنون تحریر فرماتے ہیں: أما الحديث فقد ورد من طرق كثيرة بروايات متنوعة واتفقوا على أنه حديث ضعيف وإن كثرت طرقه. [۱/ ۵۲، نفحات: ۱/ ۲۱] قال ابن عساكر: الحديث روى عن علي وعمر وأنس وابن عباس وابن مسعود ومعاذ وأبي أمامة وأبي الدرداء وابي سعيد رضی اللہ عنہم بأسانيد فيها كلها مقال. [فیض القدیر: ۶/ ۱۵۴] حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے اس پر تصحیح کی علامت لگائی ہے؛ مگر علامہ مناویؒ نے اس کی شرح میں تضعیف کی ہے [فیض القدیر: ۶/ ۱۵۴، تحت رقم الحدیث: ۸۶۴۰]

[۱۰۳] [لامع الدراری: ۱/ ۱۵۴]

اللہ صاحبؒ کی بھی ایک چہل حدیث ہے[104] اور نووی کی ''چہل حدیث'' تو مشہور ہے[105]۔

آٹھویں قسم: افراد و غرائب

یہ دونوں ایک ہی ہیں، بعض لوگوں نے فرق بھی کیا ہے، غریب اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی روایت میں کسی جگہ پر صرف ایک راوی رہ جائے، مثلاً دارِ قطنی کی ''کتاب الافراد''[106]۔

---

[104] شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی چہل حدیث بہت مختصر ہے، اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر حدیث دو جملوں پر مشتمل ہے [تقریر بخاری، ص: ۴۷]

[105] اربعینات لکھنے والوں نے مختلف انداز اختیار کئے ہیں، جیسے حافظ ابن حجرؒ نے ایک ایسی اربعین لکھی ہے جس میں بلحاظِ سند امام مسلمؒ امام بخاریؒ سے فائق ہیں، اس طرح کہ کسی حدیث پر اگر امام بخاریؒ اور حضور ﷺ کے درمیان پانچ واسطے ہیں تو وہی حدیث امام مسلمؒ کے یہاں حضور ﷺ سے چار واسطوں سے منقول ہے۔ ایک ''أربعین بلدانیه'' لکھی گئی ہے جس میں چالیس حدیثیں چالیس مشائخ سے چالیس شہروں میں لی گئی ہیں۔ اور حافظ ابو القاسم ابن عساکر الدمشقی نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر ایسی اربعین لکھی ہے جس میں أربعین حدیثا عن أربعین شیخا فی أربعین بلدا عن أربعین صحابیا کا ذکر ہے۔ [لامع الدراری: ۱/ ۱۵۷۔ کشف الظنون: ۱/ ۵۴۔ نفحات التنقیح: ۱/ ۲۲]

[106] [لامع الدراری ۱: ۱۵۸۔ کشف الظنون: ۱/ ۱۳۹۴]

(فائدہ): بعض علما کی رائے یہ ہے کہ امام بخاریؒ کی شرائط میں یہ بات ہے کہ حدیث کی سند غریب نہ ہو بلکہ عزیز ہو؛ لیکن محققین محدثین نے اس دعوے کی تردید فرمائی ہے؛ اس لئے کہ بخاری کی پہلی ہی روایت اس کی تغلیط کرتی ہے، کیونکہ اس میں حضرت عمرؓ سے لے کر یحیٰ بن سعید الانصاری تک تفرد واقع ہوا ہے، اور جو بعض علما اس کی کچھ متابعات ذکر کرتے ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں، یہ یاد رکھو کہ غریب کے لئے ضعیف ہونا ضروری نہیں، لہذا جب تم ہدایہ میں جا بجا؛ بلکہ ہر حدیث کے نیچے دیکھو قلت غریب تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ حدیث استدلال کے قابل نہیں اور اللہ کے فضل و کرم سے بخاری شریف کی پہلی حدیث ''إنما الاعمال بالنیات'' اور آخری حدیث ''کلمتان حبیبتان'' دونوں غریب ہیں۔ [تقریر بخاری: ۱/ ۴۸]

نویں قسم: مستدرک

یہ کسی کتاب کو سامنے رکھ کر لکھی جاتی ہے، مثلاً بخاری و مسلم کو سامنے رکھ کر ابو حاکم نیشا پوریؒ نے ''مستدرک'' [۱۰۷] لکھی ہے، مستدرک کا مطلب یہ ہے کہ کسی کتاب کی شرط کے مطابق کوئی روایت موجود ہے اور اس کو اس کتاب کے مصنف نے ذکر نہ کیا ہو خواہ عمداً یا سہواً، جیسے ''مشکوۃ شریف'' یہ علامہ بغویؒ کی ''مصابیح'' پر تخریج ہے اور فصل ثالث اس پر استدراک ہے [۱۰۸]۔

دسویں قسم: مستخرج

مستخرج یعنی کسی کتاب کی احادیث کو اپنی سند سے بیان کرنا بشرطیکہ مصنف اصل حائل نہ ہو [۱۰۹] اور فائدہ اس کا تقویت ہے، کیونکہ جو حدیث کسی سند کے

[۱۰۷] حاکم نیشا پوریؒ کی ''المستدرک علی الصحیحین'' سب سے زیادہ رائج اور مشہور ہے، اس میں انہوں نے وہ احادیث نقل کی ہیں جو صحیحین میں موجود نہیں؛ لیکن ان کے خیال میں بخاری اور مسلم کی شرط پر اترتی ہیں، لیکن امام حاکم علیہ الرحمۃ تصحیحِ احادیث کے معاملہ میں بہت متساہل ہیں، چنانچہ انہوں نے بہت سی حسن، ضعیف، منکر؛ بلکہ موضوع احادیث کو بھی صحیح علی شرط الشیخین قرار دے کر مستدرک میں داخل کر دیا ہے، اس لئے حافظ ذہبیؒ نے اس کی تلخیص کر کے امام حاکمؒ کی غلطیوں پر تنبہ کیا ہے، یہ تلخیص حاکم کی مستدرک کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، جب تک حدیث کے بارے میں وہ صحت کی تصدیق نہ کر دے اس وقت تک محض حاکم کی تصحیح کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ [درسِ ترمذی ۱: ۵۳] اس کی مزید وضاحت کے لئے دیکھئے [نفحات: ۱/ ۱۹]

[۱۰۸] [تقریرِ بخاری: ۱/ ۴۷]

[۱۰۹] اس طور پر کہ مصنفِ سابق کے شیخ یا استاذ یا اس سے اوپر کے کسی استاذ سے اپنی سند ملا دے، مستخرج میں کتابِ سابق کی ترتیب، اس کی سند اور متن کی رعایت کی جاتی ہے، اور یہ بات بھی پیشِ نظر رہتی ہے کہ سند اقرب سے ملائی جائے یعنی سب سے پہلی جگہ جہاں دونوں کی سندیں ملتی ہوں وہیں ملا دے، ⟵

ساتھ اصل کتاب میں ہے تو مستخرج والا اپنی مستخرج میں وہ حدیث دوسری سند سے بیان کرے گا، مثلاً "مستخرج ابو عوانہ" یہ مسلم شریف پر ہے[110]۔

گیارھویں قسم: علل

یہ نوع علوم حدیث کی انواع میں سب سے زیادہ غامض اور مشکل ہے، اس میں حدیث کی اسانید وطرق کو جمع کر کے بیان کیا جاتا ہے کہ فلاں حدیث میں یہ علت ہے، اس فن کے لیے فہمِ ثاقب اور وسیع حافظہ اور رواۃِ حدیث کی کامل معرفت اور اسانید ومتون کا پورا ملکہ ضروری ہے، اسی لیے اس فن پر بڑے بڑے حضرات ہی نے قلم اٹھایا ہے[111] مثلاً "کتاب العلل علی ابن المدینی" "کتاب العلل ابن ابی حاتم" احمد ابن حنبلؒ، بخاریؒ، مسلمؒ، ابوزرعہ رازیؒ، ترمذیؒ، اور دارِ قطنیؒ[112] ان سب میں جامع کتاب دارِ قطنیؒ کی

⊃ کیونکہ اقرب کو چھوڑ کر ابعد کے ساتھ ملانا استخراج نہیں کہلاتا الا لعذر أو زیادۃ مھمۃ.

واضح رہے کہ استخراج میں متن کے پورے الفاظ کے ساتھ موافقت ضروری نہیں ہے؛ کیونکہ روایت بالمعنی ہوتی ہے، اوراس میں الفاظ میں تفاوت ہوجاتا ہے، جیسے لاتقبل صلوۃ بغیر طھور کی جگہ لاتقبل صلوۃ الابطھور آجاتا ہے۔

[110] مستخرجات بکثرت ہیں اور مختلف کتابوں پر لکھی گئی ہیں، جیسے "مستخرج علی سنن ابی داود" محمد ابن عبد الملکؒ کی، اور "مستخرج علی جامع الترمذی" ابوعلی طوسیؒ کی، اسی طرح "مستخرج علی صحیح مسلم" ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق اسفرائینیؒ کی (نوٹ) "مستخرج ابوعوانہ کو "صحیح ابوعوانہ" بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ حافظ ابوعوانہ نے "صحیح مسلم" کے طرق کے علاوہ دوسرے طرق اور اسانید کا بھی ذکر کیا ہے اور متن میں کچھ احادیث کا اضافہ بھی فرمایا اس بنا پر اسے مستقل کتاب کی حیثیت دے کر "صحیح ابوعوانہ" کہا جاتا ہے۔ [نفحات التنقیح:۱/ ۲۰]

[111] [نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر ص:۷۵]

[112] [مقدمۂ لامع الدراری:۱/ ۱۷۱] نیز دیکھیے [تدریب الراوی:۱/ ۲۵۸۔ کشف الظنون :۲/ ۱۱۵۹۔ مقدمۂ فتح الباری، ص:۴۹۲۔ نفحات التنقیح: ۱/ ۲۴]

ہے[۱۱۳] امام ترمذیؒ کی ''کتاب العلل'' دو ہیں، ایک چھوٹی، دوسری بڑی، اول الذکر تو ''جامع ترمذی'' کے ساتھ منسلک ہے اور ثانی الذکر مستقل ہے۔

بارہویں قسم: اطراف

اطراف اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کا ایک ٹکڑا (جو بقیہ حدیث پر دلالت کرتا ہو) ذکر کر کے اس کی وہ تمام اسانید جو کتابوں میں مذکور ہیں جمع کردی جائیں، مثلاً انہوں نے عنوان باندھا ''إنما الاعمال بالنیات'' اب یہ حدیث جتنے طرق سے مروی ہے ان سب کو جمع کر دیا جائے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ حدیث تلاش کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے کہ یہ حدیث کہاں کہاں ہے، اور غلطی بھی جلدی معلوم ہو جاتی ہے، علل اور اطراف میں تھوڑا سا فرق ہے، وہ یہ کہ اطراف میں تو حدیث کی ساری اسانید کو یکجا کر دیا جاتا ہے خواہ وہ ضعیف ہوں یا صحیح، اور علل میں صرف اسانیدِ ضعیفہ کو ایک جگہ جمع کر کے ان کے نقائص پر تنبیہ کی جاتی ہے، اطراف میں بھی علما کی بیشمار تصانیف ہیں، مثلاً ابن عساکرؒ کی ''الأشراف في معرفة الأطراف'' حافظ مزّی کی ''تحفة الأشراف في معرفة الأطراف''، اسی طرح علامہ سیوطیؒ، سراج الدین عمر بن علی الملقنؒ، حافظ محمد بن طاہر مقدسیؒ نے بھی اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں[۱۱۴]۔

---

[۱۱۳] [مقدمۂ لامع الدراری: ۱/ ۱۷۱ و ۱۷۲]

[۱۱۴] ابن عساکرؒ نے اس موضوع پر سب سے پہلے دو جلدوں میں ''الأشراف في معرفة الأطراف'' کے نام سے سنن اربعہ کی اطراف لکھی، اس کتاب کو انہوں نے حروف معجم پر مرتب کیا ہے، اس کے بعد حافظ عبد الغنی مقدسیؒ نے ''اطراف الكتب الستة'' تحریر فرمائی، ⟵

تیرہویں قسم: تراجم

تراجم یعنی کسی خاص سند کو لے کر اس سند سے جتنی روایتیں مروی ہیں چاہے صحیح ہوں یا سقیم، سب ذکر کردی جائیں، مثلاً مالک عن نافع عن ابن عمر، یا ھشام عن ابیه عن عائشة اس فن میں حافظ صلاح الدین علائیؒ نے تصنیف فرمائی ہے [115]

چودہویں قسم: تعلیقہ

یہ قسم متقدمین کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ کسی خاص موضوع پر روایات کو جمع کردیا جائے، اور سند کو چھوڑ کر متن پر اکتفا کیا جائے، متأخرین کی اکثر تصانیف اسی طرح کی ہیں، مثلاً علامہ بغویؒ کی ''مصابیح'' علامہ خطیب تبریزی کی ''مشکوۃ'' بیہقیؒ کی ''مجمع الزوائد'' علامہ مغربیؒ کی ''جمع الفوائد'' علامہ سیوطیؒ کی ''جمع الجوامع'' وغیرہ۔

پندرہویں قسم: تخاریج

تخاریج کا اطلاق ان کتابوں پر ہوتا ہے جس میں کسی کتاب کی ان احادیث

---

[114] حافظ ابو مسعود ابراہیم بن محمد الدمشقیؒ نے صحیحین پر اطراف لکھی، آج کل اس نوع کی سب سے زیادہ متداول کتاب حافظ مزیؒ متوفی ۷۴۲ھ کی "تحفة الأشراف في معرفة الأطراف" ہے جس میں صحاح ستہ کے اطراف کو لکھا گیا ہے، اس نوع کے تحت "المعجم المفهرس لألفاظ الحديث النبوي" اور اس کی تلخیص "مفتاح كنوز السنة" بھی آتی ہیں۔ [کشف الظنون، ص ۱۰۳ و ۱۱۶۔ لامع: ۱/ ۱۷۱۔ نفحات: ۱/ ۲۴]

[115] اس نوع میں وہ کتابیں بھی داخل ہیں جو من روى عن أبيه عن جده کہلاتی ہیں۔ [درسِ ترمذی: ۱/ ۶۲]

کی تخریج کی گئی ہو جو اصل کتاب میں بلا سند مذکور ہوں، جیسے ''احیاء العلوم للغزالي'' کی تخریج علامہ عراقیؒ نے کی ہے، ''ہدایہ'' کی تخریج علامہ زیلعیؒ نے ''نصب الرایه'' کے نام سے کی ہے، اسی طرح ''هدایه'' کی تخریج علامہ ابن الترکمانیؒ نے بھی کی ہے[١١٦]۔

سولھویں قسم: زوائد

یہ قسم مستدرک ہی کے قریب ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ کسی کتاب کی روایات پر دوسری کتاب میں جو زائد روایات ہیں ان کو بیان کیا جائے، مثلاً حافظ مغلطائیؒ کی ''زوائد ابن حبان علی الصحیحین'' ''زوائد مسند أحمد علی الستة'' ''زوائد أبي یعلی علی الستة'' وغیرہ[١١٧]۔

سترّہویں قسم: ترغیب وترہیب

کسی خاص امر کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جو وعدے یا وعیدیں بیان فرمائی ہیں ان کو ایک جگہ جمع کر دینا ترغیب وترہیب کہلاتا ہے، مثلاً امام بیہقیؒ

---

(١١٦) ہدایہ میں ساری احادیث بلا حوالہ ہیں، ان احادیث کی سند اور حوالہ تلاش کرنے کی غرض سے جو کتابیں لکھی گئیں وہ ہدایہ کی تخریج کہلائیں گی، مثلاً ''نصب الرایة'' اور حافظ ابن حجرؒ کی ''الدرایة في تخریج أحادیث الهدایة'' نیز حافظ ابن حجرؒ نے ہی ''التلخیص الحبیر في تخریج أحادیث الرافعي الکبیر'' کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی ہے، جس میں شافعی فقہ کے ایک مشہور متن ''رافعی'' کی احادیث کی تخریج کی ہے، ان کی یہ کتاب احادیثِ احکام کا جامع ترین ذخیرہ سمجھی جاتی ہے، اسی طرح ان ہی کی کتاب ہے ''الکافي الشاف في تخریج أحادیث الکشاف''

(١١٧) اور علامہ نور الدین ہیثمیؒ کی ''موارد الظمآن إلی زوائد ابن حبان'' جس میں صحیح ابن حبان کی صرف وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جو صحیحین میں موجود نہیں ہیں۔ [درسِ ترمذی: ١/ ٦١]

کی ''ترغیب الصلوۃ'' اور حافظ زکی الدین منذریؒ کی ''الترغیب والترھیب''[۱۱۸]۔

اٹھارہویں قسم: مسلسلات

کسی سند کے رواۃ کسی ایک چیز (چاہے قولی، فعلی، حالی، مقامی) میں متفق ہوں تو وہ مسلسل کہلاتی ہے، مثلاً ''سمعت فلا نا یقول اشھد باللہ لقد حدثنی'' الخ یا ''دخلنا علی فلان فاطعمنا تمرا و ماء'' وغیرہ، اس فن پر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب ہے جس کا نام ہے ''الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین''[۱۱۹]۔

انیسویں قسم: ثلاثیات

وہ روایت جس میں محدث اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان تین راوی ہوں، مثلاً ثلاثیاتِ امام بخاری، ثلاثیاتِ امام دارمی، وغیرہ[۱۲۰]۔

---

(۱۱۸) [مقدمۂ لامع الدراری، ص ۱۸۳۔ کشف الظنون، ص: ۴۰۰]

(۱۱۹) ابوبکر بن شاذان، ابونعیم اور مستغفری وغیرہ نے بھی مسلسلات لکھی ہیں [الرسالۃ المستطرفۃ ص: ۶۹] حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے دو مسلسلات لکھی ہیں [لامع الدراری: ۱/ ۱۸۶۔ کشف الظنون: ۲/ ۱۶۷۷۔ نفحات: ۱/ ۲۴]

(۱۲۰) بخاری میں بائیس ثلاثی روایات ہیں، ان میں امام ابوحنیفہؒ کے دو شاگرد مکی بن ابراہیمؒ سے گیارہ اور ابوعاصم النبیل ضحاک بن مخلدؒ سے چھ اور امام ابو یوسفؒ و امام زفرؒ کے شاگرد محمد بن عبداللہ انصاریؒ سے تین، اس طرح بائیس میں سے حنفی مشائخ سے بیس روایات لی گئی ہیں، باقی دو روایتوں میں سے ایک خلاد بن یحیٰ کوفیؒ سے دوسری عصام بن خالد حمصیؒ سے لی گئی ہیں، ان کے متعلق یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ حنفی ہیں یا نہیں، یہ بائیس روایات سند کے اعتبار سے بائیس ہیں لیکن بلحاظ متن سترہ ہیں۔

بیسویں قسم: امالی

امالی: یہ املاء کی جمع ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ درمیان میں بیٹھ

⬅ امام بخاریؒ کی ثلاثیات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہیں، لیکن امام ابوحنیفہؒ جن کی زیادہ تر روایات ثلاثی ہیں اور بکثرت ثنائی، جیسا کہ ''مسانید امام اعظم'' اور ''کتاب الآثار'' سے ظاہر ہے، اور امام اعظمؒ رؤیتاً تابعی بھی ہیں اس لئے کہ حضرت انسؓ کی انہوں نے زیارت کی ہے؛ بلکہ روایتاً بھی ان کو تابعی کہا گیا ہے، اگرچہ اس میں اختلاف ہے، اس کے باوجود امام ابوحنیفہؒ کی ثنائی اور ثلاثی روایت کو صحیح اہمیت نہیں دی جاتی جو شکایت کی بات ہے۔

بخاری کے علاوہ ''ابن ماجہ'' میں پانچ ثلاثی روایات ہیں [ص: ۲۳۴، ۲۳۷، ۲۴۰، ۲۴۸، ۳۱۷] ''ترمذی'' میں ایک روایت ہے [۲/ ۵۲، رقم: ۲۲۶۰] مسلم، ابوداود اور نسائی میں کوئی روایت ثلاثی نہیں، ملا علی قاریؒ کو ''مرقاۃ'' کے مقدمہ میں وہم ہوا ہے اور انہوں نے ''ترمذی'' کی روایت کو ثنائی کہہ دیا جب کہ وہ ثلاثی ہے، کتاب الفتن کی روایت ہے **يأتي علی الناس زمان الصابر فيهم علی دينه كالقابض علی الجمر** [جامع ترمذی: ۲/ ۵۲، رقم: ۲۲۶۰] لیکن جب ملا علی قاریؒ مشکوۃ کی شرح کرتے ہوئے اس حدیث پر پہنچے تو انہوں نے ''ترمذی'' کی اس روایت کو ثلاثی لکھا ہے [مرقاۃ: ۱۰/ ۹۸] اور یہی صحیح ہے۔

ملا علی قاریؒ سے مقدمۂ مرقاۃ میں اس مقام پر ایک دوسرا سہو اور ہوا ہے، انہوں نے مسلم اور ابوداود کے بارے میں اشارہ کیا ہے کہ ان دونوں میں بھی ثلاثی روایات موجود ہیں [مرقاۃ: ۱/ ۲۳] حالانکہ مسلم اور ابوداود میں کوئی ثلاثی روایت موجود نہیں؛ البتہ ابوداود میں ایک روایت رباعی فی حکم الثلاثی موجود ہے [ابوداود ص ۲۹۷ ج ۲] یعنی مصنف سے لے کر حضور ﷺ تک چار واسطے ہیں؛ لیکن ان میں دو راوی ایک ہی طبقے کے ہیں یعنی تابعی ہیں، تو اتحاد طبقہ کی وجہ سے حکماً ثلاثی کہا جاتا ہے، اور اصطلاح میں اس کا نام ''رباعی فی حکم الثلاثی'' ہے، مسلم میں کوئی روایت ثلاثی نہیں؛ البتہ امام مسلمؒ کی دوسری بعض کتابوں میں ثلاثی روایت موجود ہے۔

بخاری اور مسلم کی سب سے نازل سند وہ ہے جس میں مصنف اور حضور ﷺ تک نو واسطے ہیں، ایسی سند کو تساعی کہا جاتا ہے، ترمذی اور نسائی کی سند نازل عشاری ہے [تدریب الراوی: ۲/ ۱۶۶۔ ترمذی محققہ ابراہیم عطوہ عوض: ۵/ ۱۶۷۔ نسائی: ۱/ ۱۵۵] یعنی مصنف سے لے کر حضور ﷺ تک دس واسطے ہیں، ابوداود کی سند نازل ثمانی ہے، مسند احمد بن حنبل میں صاحب عقود اللآلی کے بقول ۳۳۷/ سندیں ثلاثی ہیں۔ [**عقود اللآلي في الأسانيد العوالي** ص ۱۲۷، **نفحات التنقيح**: ۱/ ۲۶]

جائے اوران کے شاگردان کے اردگرد قلم، دوات اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتے، پھر شیخ تقریر ودرس دیتا اور تلامذہ اس کو لکھ لیتے پھر وہ ایک کتاب بن جاتی، اس کا نام ''امالی'' رکھ دیتے، پہلے یہی دستور تھا، اس میں حافظ ابن حجرؒ کی ''امالی'' ہے[۱۳۱]۔

اکیسویں قسم: مختصر

کسی مؤلف کی تالیف کردہ کتاب کو لے کر مختصر کردیا جائے، جیسے منذریؒ کی ''مختصر سننِ ابی داود'' اور قرطبی کی ''مختصر صحیح مسلم'' وغیرہ۔

بائیسویں قسم: شرح الآثار

حدیث میں آنے والا کوئی لفظ کثیر الاستعمال ہے؛ لیکن اس کے مدلول کی تعیین میں دقت ہے تو اس کے لیے اس نوع کی ضرورت پیش آئے گی، اس میں بھی علما نے کافی تصانیف چھوڑی ہیں، مثلاً ''شرح معاني الآثار للطحاوي'' اسی طرح ''مشکل الآثار'' وغیرہ۔

تیئیسویں قسم: اسباب الحدیث

اس میں حدیث کا شانِ ورود، اس کی جگہ اور زمانہ بتلایا جاتا ہے، اس فن

[۱۳۱] جب طباعت کا رواج عام ہوگیا تو احادیث کی تدریس کے لیے املا کی ضرورت باقی نہ رہی؛ لیکن احادیث کی تشریح اور اس کے متعلقات جو استاذ بطور تقریر بیان کرتا ہے اسے قلمبند کرنے کا دستور اب تک جاری ہے، اور آج کل انہی تقاریر کو ''امالی'' کہتے ہیں اس نوع کی بہت سے تقاریر شائع ہو چکی ہیں جیسے: فیض الباري، الکوکب الدري، لامع الدراري، درسِ ترمذی، تقریرِ بخاری، نفحات التنقیح، کشف الباري عما في صحیح البخاری وغیرہ۔

میں سب سے پہلے حامد جرجانی نے اور پھر ابوحفص عکبری نے تصنیف کی ہے، ابن حمزہ حسینی کی کتاب ''البیان والتعریف في أسباب ورود الحدیث'' بھی ہے جو مصر میں چھپ چکی ہے[۱۲۲]۔

چوبیسویں قسم: ترتیب

متقدمین کی اکثر تصانیف غیر مرتب تھیں، متاخرین نے اس پر سعی وکوشش کر کے ان کو مرتب کیا، مثلاً ابوالمحاسن حسینیؒ کی ترتیب ''اطراف المزي علی الالفاظ'' اور حافظ مغلطائی کی ترتیب ''المبهمات علی الأبواب'' وغیرہ[۱۲۳]

پچیسویں قسم

تالیف علی حروف المعجم في ألفاظ الحدیث

یعنی حدیث کی ابتدا کس لفظ سے ہوئی، اگر حرف الف سے ہوئی ہے تو پہلے ان کو اور اگر حرف باء سے ہوئی ہے تو ان کو، وعلی ہذا القیاس، اس میں اور چوتھی قسم

[۱۲۲] حدیث میں اس کی وہی حیثیت ہے جو تفسیر میں اسباب النزول کی ہے، یعنی اس میں قولی احادیث کا سببِ ورود بیان کیا جاتا ہے، حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں: اس میں سب سے پہلی تصنیف امام ابوحفص العکبریؒ کی ہے، ان کے بعد حامد بن کرزیؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی اس پر قلم اٹھایا ہے، صاحبِ کشف الظنون لکھتے ہیں: ہمارے دور میں اس نوع کی صرف ایک کتاب باقی رہ گئی ہے جس کا نام ''البیان والتعریف في أسباب ورود الحدیث الشریف'' ہے اور وہ علامہ ابراہیم بن محمد الشہیر بابن حمزہ الحسینی الدمشقی الحنفی کی تالیف ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ [درس ترمذی: ۱/ ۶۰، ۶۱)

[۱۲۳] اور جیسے ''ترتیب مسند احمد علی الحروف لابن کثیر'' اور ''ترتیب مسند احمد علی الحروف لابن المجیب'' اسی طرح آخری دور میں علامہ ابن الساعاتیؒ نے مسند احمد کو ''الفتح الربانی'' کے نام سے ابواب کی ترتیب پر مرتب کیا ہے۔ [درس ترمذی: ۱/ ۶۱]

(معجم) میں فرق یہ ہے کہ وہ سند کے اعتبار سے تھی اور یہ متن کے لحاظ سے، اس نوع میں بیسیوں تصنیفات موجود ہیں علامہ سیوطیؒ کی ''جامعِ صغیر'' دیلمی کی ''مسندِ فردوس'' سخاویؒ کی ''مقاصد حسنہ'' وغیرہ۔

چھبیسویں قسم: موضوعات

یہ نوع حدیث کی اہم انواع میں سے ہے، یعنی وہ کتابیں جو موضوع اور من گھڑت حدیثوں کو بیان کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں [۱۳۰] اس باب میں ابن جوزیؒ

---

(۱۳۰) شروع میں کتب موضوعہ اس انداز سے لکھی جاتی تھیں کہ ضعیف راویوں کا تذکرہ کیا جاتا تھا، اوران سے جو موضوع یا ضعیف احادیث مروی ہیں ان کی نشاندہی کی جاتی تھی، حافظ ابن عدیؒ کی ''الکامل'' ''امام عقیلیؒ کی ''الضعفاء'' اور امام جوزقانیؒ کی ''الاباطیل'' اسی انداز پر ہیں۔

بعد میں موضوعات کا طریقہ یہ ہوگیا کہ موضوع یا متہم بالوضع احادیث کو ابواب کی ترتیب سے یا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کو کس نے روایت کیا ہے اور اس میں سنداً کیا نقص ہے، اس موضوع پر سب سے پہلے ابن الجوزیؒ نے قلم اٹھایا، ان کی دو کتابیں ہیں، ایک ''العلل المتناهيه في الاخبار الواهية'' دوسری ''الموضوعات الكبرىٰ'' ان میں دوسری آج بھی دستیاب ہے، لیکن اہل علم کا اتفاق ہے کہ علامہ ابن الجوزیؒ احادیث پر وضع کا حکم لگانے میں نہایت متشدد ہیں اور انہوں نے بہت سی صحیح احادیث کو بھی موضوع قرار دے دیا ہے، اس لیے بعد کے محقق علماء نے ان کی کتابوں پر تنقیدیں لکھیں، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے ان کی تردید میں ''القول المسدّد في الذب عن مسند احمد'' میں ان کی بہت اچھی تردید کی ہے، اس میں حافظؒ نے ''مسند احمد'' کی ان احادیث کی تحقیق کی ہے جنہیں ابن الجوزیؒ نے موضوع قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ جن احادیث پر ابن الجوزیؒ نے موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے ان میں سے ایک حدیث صحیح مسلم میں بھی موجود ہے، اور ایک حدیث بخاری کی احمد شاکر والے نسخہ میں بھی ہے، اور ایسی احادیث تو بہت سی ہیں جو امام بخاریؒ نے تعلیقاً روایت کی ہیں، اور ابن الجوزیؒ نے انہیں موضوع قرار دے دیا ہے، پھر علامہ سیوطیؒ نے ابن الجوزیؒ کی موضوعات پر ایک مفصل تنقید لکھی جس کا نام ''النكت البديعات على الموضوعات'' رکھا بعد میں اس کی تلخیص کی اور اس میں کچھ اضافے کئے جو ''اللآلي المصنوعه في الأحاديث الموضوعة'' کے نام سے معروف ہے، ←

امام ہیں، انہوں نے سب سے پہلے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اور بھی بے شمار تصانیف اس موضوع پر ہیں، مثلاً قاضی شوکانیؒ کی ''الفوائد المجموعة في بيان الأحاديث الموضوعة'' ملا علی قاریؒ کی ''موضوعات کبیر'' علامہ محمد طاہر پٹنیؒ کی ''تذكرة الموضوعات'' اور علامہ سیوطیؒ کی ''اللآلي المصنوعة'' وغیرہ۔

ستائیسویں قسم

الكتب المؤلفة في الأدعية الماثورة

یعنی وہ کتابیں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو دعائیں مروی ہیں ان کو جمع کیا گیا ہو، اس میں زیادہ مشہور حافظ احمد ابن السنیؒ کی ''عمل اليوم الليلة'' اور شیخ محمد بن محمد جزریؒ کی ''حصن حصين'' اور ملا علی قاریؒ کی ''الحزب الاعظم والورد الافخم'' ہے۔

⊂ لیکن علامہ سیوطیؒ حدیث کے معاملہ میں قدرے متساہل ہیں، اس لئے بعض ضعیف یا منکر احادیث کو بھی صحیح قرار دے دیتے ہیں، علامہ ابن الجوزیؒ کے بعد حافظ صنعانیؒ کی موضوعات بھی بہت مقبول ہوئیں، علامہ ابن الجوزیؒ اور علامہ سیوطیؒ کے بعد بہت سے حضرات نے موضوعات پر کتابیں لکھیں، جن میں ملا علی قاریؒ کی ''الموضوعات الكبرى'' نہایت مقبول و معروف ہے، آخری دور میں قاضی شوکانیؒ کی ''الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة'' اور علامہ طاہر پٹنیؒ کی ''تذكرة الموضوعات'' مختصر مگر مفید کتابیں ہیں۔

اس نوع کا جامع ترین کام علامہ ابن عراقؒ نے انجام دیا، انہوں نے اپنی کتاب ''تنزيه الشرعية المرفوعة عن الاحاديث الشنيعة الموضوعة'' میں ابن جوزیؒ، جوزقانی، عقیلیؒ، حافظ ابن حجرؒ، علامہ سیوطیؒ، اور ملا علی قاریؒ کی تمام کتابوں کو جمع کر دیا ہے، اور ہر حدیث کی خوب تحقیق کی ہے، اس طرح ان کی کتاب جامع ترین بھی ہے اور محقق ترین بھی، جو بسا اوقات پچھلی تمام کتابوں سے مستغنی کر دیتی ہے، اس کتاب میں علامہ ابن عراقؒ نے ابن جوزیؒ، جوزقانیؒ، اور سیوطیؒ کی بیان کردہ احادیث میں سے صرف ان احادیث کو جمع کیا ہے جو فی الواقع موضوع ہیں۔ [درسِ ترمذی: ۱/ ۵۹]

اٹھائیسویں قسم: ناسخ ومنسوخ

یعنی وہ کتاب جس میں یہ بتلایا گیا ہو کہ کونسی حدیث منسوخ ہے اور کونسی ناسخ؟ ایک فقیہ کے لیے اس کا جاننا نہایت ضروری ہے، اس موضوع پر علامہ حازمیؒ کی کتاب ''کتاب الاعتبار في الناسخ والمنسوخ من الآثار'' مشہور ہے، یہ کتاب حیدرآباد میں چھپ چکی ہے۔

انتیسویں قسم (۱۲۵): متشابہ الحدیث

یعنی وہ کتاب جس میں متشابہاتِ احادیث کے قبیل کی چیزوں کو جمع کردیا

---

(۱۲۵) حضرت استاذ مدظلہم نے یہ انتیس قسمیں بیان فرمائی ہیں، مزید چند اقسام ان میں شامل کی جاتی ہیں۔
[۱] الوحدان: یعنی ان راویوں کی احادیث کا مجموعہ جن سے صرف ایک ایک حدیث مروی ہے۔
[۲] شروح الحدیث: یعنی وہ کتابیں جن میں کسی حدیث کی کتاب کی شرح کی گئی ہو، مثلاً: ''فتح الباری'' ''عمدة القاری'' وغیرہ۔
[۳] کتب المصاحف: ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں قرآن کریم کی جمع وترتیب، اختلافِ قراءات اور اختلاف نسخ کی تاریخ بیان کی جاتی ہے، مثلاً ابن عامر کی ''کتاب المصاحف'' اس کے علاوہ بہت سے لوگوں نے ''کتاب المصاحف'' کے نام سے کتابیں لکھی ہیں، جن میں ''کتاب المصاحف لابن اشتہ'' ''کتاب المصاحف لابن ابی داود'' ''کتاب المصاحف لابن الانباری'' زیادہ مشہور ہیں؛ لیکن آج ان میں صرف ایک کتاب موجود ہے ''کتاب المصاحف لابن ابی داود'' جو امام ابوداود صاحب السننؒ کے صاحبزادے کی تالیف ہے، اور کچھ عرصہ پہلے اسے ایک انگریز مستشرق نے شائع کیا ہے۔
[۴] الفہارس: وہ کتب حدیث جن میں ایک یا زائد کتابوں کی احادیث کی فہرست جمع کردی گئی ہو؛ تاکہ حدیث کا نکالنا آسان ہو، مثلاً علامہ زاہد الکوثریؒ کے ایک شاگرد نے ''فہارس البخاری'' کے نام سے ایک بڑی مفید کتاب لکھی ہے، جس کی ذریعہ بخاری سے حدیث نکالنا بہت آسان ہوگیا ہے، اس سلسلہ کا ایک جامع اور مفید کام اللہ تعالی نے مستشرقین کی ایک جماعت سے لیا، ←

گیا ہو، حافظ شمس الدین محمد بن اللبان نے اس موضوع پر تصنیف فرمائی ہے۔

جس نے ''ڈاکٹر وینسنک'' کی سربراہی میں سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک مفصل کتاب مرتب کی ہے، جس کا نام ہے ''المعجم المفہرس لألفاظ الحدیث النبوی'' جس میں انہوں نے صحاح ستہ، موطأ امام مالک، سنن دارمی اور مسند احمد کی احادیث کی فہرست مرتب کی ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ حروف تہجی کے اعتبار سے انہوں نے ہر لفظ کے تحت یہ بیان کیا ہے کہ یہ لفظ کون سی حدیث میں آیا ہے اور وہ حدیث کہاں کہاں مذکور ہے؛ البتہ اس کتاب میں یہ لوگ احادیث کے استیعاب پر قادر نہیں ہو سکے؛ بلکہ بہت سی احادیث چھوٹ گئی ہیں، پھر اسی کتاب کی ایک تلخیص ''وینسنک'' ہی نے ''مفتاح کنوز السنة'' کے نام سے شائع کی ہے جو مختصر ہونے کی وجہ سے انتہائی مفید ہے اور ہر طالب علم کے لئے ناگزیر ہے۔

[۵] **کتب الجمع**: ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں ایک سے زائد کتب حدیث کی روایتوں کو بحذف تکرار جمع کر دیا جائے، اس نوع کی سب سے پہلی کتاب امام حمیدیؒ کی ''الجمع بین الصحیحین'' ہے، ان کے بعد حافظ رزین بن معاویہؒ نے ''تجرید الصحاح الستة'' لکھی جن میں صحاح ستہ کی تمام احادیث کو جمع کیا گیا؛ البتہ ان کی اصطلاح میں ابن ماجہ کی بجائے موطأ امام مالکؒ صحاح ستہ میں شامل تھی، اسی لئے انہوں نے اپنی کتاب میں ابن ماجہ کے بجائے موطأ امام مالک کو شامل کیا، ان کے بعد حافظ ابن اثیر جزری نے ''جامع الاصول'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں صحاح ستہ کی احادیث کو جمع کیا گیا اور حافظ رزین بن معاویہؒ سے جو احادیث چھوٹ گئی تھیں ان کو بھی شامل کرلیا؛ لیکن ان کی اصطلاح میں بھی موطأ امام مالک صحاح ستہ میں شامل تھی، نہ کہ ابن ماجہ، ان کے بعد علامہ نورالدین ہیثمیؒ تشریف لائے اور انہوں نے ''مجمع الزوائد ومنبع الفوائد'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی، اور اس میں مسند احمد، مسند بزار، مسند ابی یعلی، اور امام طبرانیؒ کی معاجم ثلاثہ کی ان زائد احادیث کو یکجا کر دیا جو صحاح ستہ میں نہیں آئیں؛ لیکن علامہ ہیثمیؒ کی اصطلاح میں ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل تھی نہ کہ موطأ امام مالکؒ، اس لئے انہوں نے ''مجمع الزوائد'' میں ابن ماجہ کی احادیث نہیں لیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن ماجہ کی احادیث نہ ''جامع الاصول'' میں جمع ہوسکیں نہ ''تجرید الصحاح الستہ'' میں اور نہ ہی ''مجمع الزوائد'' میں۔

ان کے بعد علامہ محمد بن سلیمان نے ''جمع الفوائد من جامع الأصول ومجمع الزوائد'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں ایک طرف تو ''جامع الأصول'' اور ''مجمع الزوائد'' کی تمام احادیث کو بحذف تکرار جمع کر دیا؛ نیز ''ابن ماجہ'' جو ان دونوں سے چھوٹ گئی تھی اس کی روایات بھی لے لیں؛ بلکہ اس کے علاوہ ''سننِ دارمی'' کی روایات بھی جمع کر دیں،

⊃ حاشیہ گذشتہ صفحہ سے پیوستہ

اس طرح یہ کتاب چودہ (۱۴) کتب احادیث کا مجموعہ بن گئی، بلاشبہ "جمع الفوائد" اپنے اختصار کے باوجود احادیث کا بڑا جامع مجموعہ ہے؛ لیکن احقر کا تجربہ یہ ہے کہ اس میں بہت سی احادیث چھوٹ گئی ہیں اور اگر کوئی حدیث اس میں نہ ملے تو یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ چودہ کتابوں میں بھی نہیں ہے۔

اب تک "کتب الجمع" کے تحت ہم نے جن کتابوں کو ذکر کیا یہ ساری کتابیں ابواب کی ترتیب پر لکھی گئی ہیں، بعض حضرات نے احادیث کو حروف تہجی کی ترتیب سے بھی جمع کیا ہے، اس نوع کی سب سے پہلی کتاب "فردوس الدیلمی" ہے؛ لیکن یہ کتاب نایاب ہے، اس کے بعد علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے "جمع الجوامع" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں پورے ذخیرۂ احادیث کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں انہوں نے قولی احادیث کو حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کیا ہے، اور فعلی احادیث کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ترتیب سے، پھر علامہ سیوطیؒ ہی نے اس کتاب کی تلخیص "الجامع الصغیر في أحادیث البشیر النذیر صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے کی، اس کتاب میں تمام موجود کتب حدیث میں سے قولی احادیث کو حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کر دیا گیا ہے، "جمع الجوامع" تو آج کل نایاب ہو چکی ہے، لیکن "الجامع الصغیر" مروج ہے، اور اس میں ہر حدیث کے ساتھ اس کے حوالہ کے علاوہ اس کی اسنادی حیثیت بھی اس طرح متعین کی گئی ہے کہ صحیح کے لئے "صح" ضعیف کے لئے حرف "ض" اور حسن کے لئے حرف "ح" لکھدیا گیا ہے؛ لیکن مولانا عبدالحئی لکھنویؒ نے "الأجوبة الفاضلة" میں ص ۱۲۷ پر لکھا ہے کہ یہ علامتیں علامہ سیوطیؒ نے نہیں لگائیں؛ بلکہ ان کے بعد کسی عالم نے لگائی ہیں۔

"الجامع الصغیر" کی متعدد شروح بھی لکھی گئی ہیں، جن میں علامہ مناویؒ کی "فیض القدیر" اور علامہ عزیزیؒ کی "السراج المنیر" مشہور اور متداول ہیں، ان دونوں میں سے علامہ مناویؒ تصحیح احادیث کے معاملہ میں زیادہ محتاط ہیں، ان کے برخلاف علامہ عزیزیؒ قدرے متساہل ہیں۔

اس سلسلہ کا سب سے زیادہ قابل قدر اور جامع کام علامہ علی المتقی گجراتیؒ نے کیا، ان کی کتاب "کنز العمال في سنن الأقوال والأفعال" کو بلاشبہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع ترین کتاب کہنا چاہئے، انہوں نے اپنی اس کتاب کو علامہ سیوطیؒ کی "جمع الجوامع" پر مبنی کیا ہے، یعنی پہلے ہر باب کی وہ قولی احادیث جمع کیں جو "جمع الجوامع" میں موجود تھیں، اس کے بعد وہ قولی احادیث جمع کیں جو علامہ سیوطیؒ سے چھوٹ گئی تھیں، اور ان کا نام "الأکمال في سنن الأقوال" رکھا، پھر "جمع الجوامع" کی فعلی احادیث کو جو صحابہؓ کی ترتیب پر تھیں ابواب کی ترتیب پر مرتب کیا، اور اس مجموعہ کا نام "کنز العمال" ہے، اس میں ہر حدیث کے ساتھ اس کے ماخذ کا حوالہ رموز میں دیا ہے، جیسے بخاری کے لئے "خ" اور مستدرک کے لئے "ک" وغیرہ، علامہ علی المتقیؒ نے اپنی اس کتاب میں، ⊂

◄ حاشیہ گذشتہ صفحہ سے پیوستہ

تقریباً تیس (۳۰) کتب حدیث کو جمع کر دیا ہے، اس طرح یہ کتاب کسی حدیث کی تحقیق کے لئے بے نظیر رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

[۶] کتاب الأحکام: ان کتابوں میں مسائلِ فقہیہ کے متعلق روایات ذکر کی جاتی ہیں، جیسے: صحاح ستہ اور حافظ عبد الحقؒ کی کتاب ''الأحکام الصغری'' اور ''الأحکام الکبریٰ'' اور عبد الغنی مقدسی کی ''عمدۃ الاحکام'' [سیر أعلام النبلاء: ۲۱/ ۱۹۹۔ کشف الظنون: ۲/ ۱۱۶۴]

[۷] کتاب التاریخ: یہ وہ قسم ہے جس میں تاریخی مواد سے متعلق روایات کو درج کیا جاتا ہے، پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں ابتدائے خلق سے لے کر آپ ا کے بعد تک کے واقعات ذکر کئے جاتے ہیں، جیسے امام بخاریؒ کی کتاب ''بدء المخلوقات'' اور دوسری قسم وہ ہے جس میں حضور ا سے متعلق تاریخی مواد پیش کیا جاتا ہے، جیسے ''سیرت ابن ہشام'' اور ''مغازی محمد بن اسحق'' [عجالۂ نافعہ، ص: ۱۴، وفوائد جامعہ، ص: ۱۴۷]

[۸] کتاب الزھد: ایسے مضامین کی روایات جن سے قلب میں رقّت پیدا ہوتی ہے اور فکر آخرت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، اس باب میں عبد اللہ بن مبارکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ، امام ابوداودؒ، امام ترمذیؒ، اور بیہقیؒ وغیرہ کی کتابیں ہیں۔

[۹] کتاب الآداب: کھانے پینے، سونے جاگنے، رفتار وگفتار کے متعلق روایتیں ذکر کی جائیں، امام بخاریؒ کی ''الأدب المفرد'' اس سلسلے کی مشہور کتاب ہے۔

[۱۰] کتاب الفتن: فتنوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ذکر کی جائیں، جیسے نعیم بن حمادؒ کی ''کتاب الفتن والملاحم'' [کشف الظنون: ۲/ ۱۴۴۵]

[۱۱] کتاب المناقب: کسی قوم یا جماعت یا فرد سے متعلق فضائل کی روایات جمع کی جائیں، جیسے امام نسائیؒ کی ''خصائص علي'' [کشف الظنون: ۱/ ۷۰۶] اور محب الدین الطبری (متوفی ۶۹۴ھ) کی ''الریاض النضرۃ في فضائل العشرۃ'' [کشف الظنون: ۱/ ۹۳۷]

[۱۲] کتاب العقائد: جس میں عقائد کی احادیث ذکر کی جائیں، جیسے بیہقیؒ کی ''کتاب الأسماء والصفات'' اور ابن خزیمہؒ کی ''کتاب التوحید'' اور امام بخاریؒ کی ''خلق افعال العباد'' [مقدمۂ لامع الدراری: ۱/ ۱۴۳۔ کشف الظنون: ۱/ ۷۲۲]

عن ابن مسعود رضي الله عنه قال:
سمعت رسول الله صلّى الله عليه وسلّم
يقول: (نضَّر الله امرءًا سمع منا شيئًا فأبلغه
كما سمعه, فرُبّ مُبلَّغ أوعى له من سامع),
رواه الترمذي وقال حسن صحيح.

تیسرا باب

طبقاتِ کتبِ حدیث

طبقاتِ کتبِ حدیث

طبقاتِ کتبِ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس میں وہ کتابیں مذکور ہیں جن کے متعلق اجنبی کے واسطے یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے ہم کن کتابوں کی احادیث پر اعتماد کریں اور کن پر نہیں، اس لیے اب اس کی بڑی ضرورت ہے کہ کتبِ حدیث کے طبقات بھی ذکر کر دیے جائیں۔

اس لیے غور سے سنو کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ''عجالۂ نافعہ'' میں کتبِ حدیث کی چار قسمیں اپنے والد محترم حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اتباع میں بیان فرمائی ہیں؛ مگر خود شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی دوسری کتاب ''مایجب حفظه للناظر''[۱۳۰] میں پانچ قسمیں بیان کر دیں، یہ بظاہر ایک تعارض ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ کوئی تعارض نہیں کیونکہ ''عجالۂ نافعه'' میں جو تقسیم ہے وہ شہرت وصحت ہر دو اعتبار سے ہے، اور ''مایجب حفظه للناظر'' میں جو تفصیل ہے وہ صرف صحت کے اعتبار سے ہے، کیونکہ بہت سی کتب ایسی ہیں جو صحیح تو خوب ہیں؛ مگر درجۂ شہرت کو نہیں پہنچیں، جیسے ''صحیح ابن خزیمه'' ''صحیح ابن حبان'' ''منتقی الجارود'' وغیرہ، اور بعض کتابیں ایسی ہیں جو زیادہ صحیح تو نہیں ہیں؛ لیکن شہرت ان کی

[۱۳۰] حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے ایک شاگرد کو ایک مکتوب لکھا جو کہ ایک مختصر رسالہ کی حیثیت رکھتا ہے، اسی کا نام ہے ''مایجب حفظه للناظر''

خوب ہے جیسے: ''ابن ماجه'' وغیرہ، ہم اس جگہ ''عجالۂ نافعه'' کی پوری عبارت نقل کرتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ حدیث کی کتابیں صحت، شہرت اور قبولیت کے اعتبار سے کئی طبقوں پر مشتمل ہیں، صحت سے ہماری مراد یہ ہے کہ مؤلفِ کتاب نے اس بات کی پابندی کی ہو کہ وہ صحیح یا حسن حدیثوں کے سوا اور کوئی حدیث اس میں درج نہیں کرے گا، اور اگر اس میں کوئی ایسی حدیث درج کرتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ اس کے ضعف، غرابت، علت اور شذوذ کو بھی بتادیتا ہے تو پھر کوئی حرج نہیں، کیونکہ ضعیف، غریب اور معلول حدیث کو اس کی خرابی کی وضاحت کے ساتھ کتاب میں درج کرنا کسی قسم کی قباحت کا موجب نہیں۔

شہرت سے ہماری مراد یہ ہے کہ محدثین کی جماعت یکے بعد دیگرے (ہر دور میں) اس کتاب کے ساتھ بطریقِ روایت، ضبطِ مشکل اور تخریجِ احادیث میں مشغول رہی ہو حتیٰ کہ اس کی کوئی چیز بیان ہوئے بغیر نہ رہ گئی ہو۔

قبولیت سے ہماری مراد یہ ہے کہ ناقدینِ حدیث اس کتاب کو تسلیم کریں، اور اس پر اعتراض نہ کریں، اور اس کتاب کی حدیثوں کے متعلق مؤلف کا حکم اور فیصلہ درست سمجھیں، اور فقہا بغیر اختلاف اور بلا نکیر اس سے استدلال کریں۔

پہلا طبقہ

اس میں حدیث کی صرف تین کتابیں داخل ہیں:

[۱] موطأ امام مالک۔ [۲] صحیح بخاری۔ [۳] مسلم شریف۔

قاضی عیاضؒ نے ''مشارق الأنوار'' میں انہی تین کتابوں کی شرح کی

ہے، یہ ''مشارق الأنوار'' صغانی کی ''مشارق الأنوار'' کے علاوہ ہے جس میں ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' کی حدیثوں کو ان کی سند اور قصے حذف کر کے جمع کیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ان تینوں کتابوں کی حدیثوں کی شرح اور ضبط اسما کے لیے قاضی عیاضؒ کی کتاب ''مشارق الأنوار'' کافی وشافی ہے۔

ان تینوں کتابوں میں باہم نسبت یہ ہے کہ ''موطأ امام مالک'' گویا صحیحین کی اصل اور اس کا ماخذ ہے اور اس کی شہرت بھی کمال کو پہونچی ہوئی ہے، امام مالکؒ کے زمانہ ہی میں آپ سے ایک ہزار علماء نے ''موطأ'' کی روایت کی ہے، جیسے امام شافعی، امام محمد، یحی ابن یحی بن مصمودی، یحی بن یحی علیمی، یحیی بن بکیرؒ، ابومصعبؒ، اور قعنبیؒ وغیرہ۔

نیز اس کتاب کی عدالت وضبطِ رجال پر سب کا اجماع ہے، اور یہ مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ، عراق، شام، یمن، مصر اور دیار مغرب میں مشہور ہے، اور (بکثرت) شہروں کے فقہا کا مدار اسی کتاب پر ہے، امام مالکؒ کے زمانہ میں اور آپ کے بعد بھی علما نے ''موطأ'' کی حدیثوں کی تخریج، اس کے متابعات، اور شواہد کے جمع کرنے میں بڑی کوششیں کی ہیں، اور اس کے الفاظِ غریبہ کی شرح ضبط مشکلات اور ان کی وضاحت فقیہانہ مسائل کا بیان، حدیث کی سندیں، اور طریق روایت کے بیان میں اتنا اہتمام کیا ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' بسط وتفصیل اور حدیثوں کی تعداد کے اعتبار سے ہر چند ''موطأ'' سے دس گنی زیادہ ہوں گی؛ لیکن حدیثوں کی روایت کا

طریقہ، راویوں کی جانچ پڑتال کا ڈھنگ، اعتبار اور استنباط کا اسلوب ''موطأ'' ہی سے سیکھا ہے؛ مگر اس کے باوجود یہ دونوں کتابیں تمام فرق اسلامیہ اور علمائے اسلام کی مخدوم ہیں، محدثین کی ایک جماعت نے ان کی مستخرجات لکھی ہیں، جیسے اسماعیلی اور ابوعوانہ، اور بعض محدثین نے ان کے الفاظِ غریبہ کی شرح لکھی ہے، مشکل الفاظ اور اسما کو ضبط کیا ہے، مشکل مقامات کو حل کیا ہے، مسائلِ فقہیہ کو بیان کیا ہے، اور راویوں کے حالات قلمبند کیے ہیں، غرض یہ کہ دونوں کتابیں شہرت اور قبولیت کے درجہ کو پہنچ گئی ہیں، صاحبِ جامع الاصول نے فربری سے نقل کیا ہے کہ نوے ہزار علماء نے امام بخاریؒ سے ''بخاری'' کا سماع کیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ان تینوں کتابوں کی حدیثیں سب سے زیادہ صحیح حدیثیں ہیں اگرچہ ان میں بعض حدیثیں بعض کی بنسبت زیادہ صحیح ہیں، اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو ''موطأ'' کی اکثر مرفوع حدیثیں ''صحیح بخاری'' میں موجود ہیں، اس اعتبار سے گویا ''صحیح بخاری'' ''موطأ'' کی جامع ہے؛ البتہ آثارِ صحابہ وتابعین ''موطأ'' میں زیادہ ہیں، لہٰذا ان تینوں کتابوں کو طبقۂ اولیٰ میں رکھنا چاہیے۔

دوسرا طبقہ

اس میں حدیث کی وہ تمام کتابیں داخل ہیں جن کی حدیثیں ان تینوں صفتوں (صحت، شہرت، اور قبولیت) میں صحیح بخاری، اور صحیح مسلم کے درجہ کو نہ پہنچ سکی ہوں؛ لیکن مذکورہ بالا صفات میں وہ ان کے قریب قریب ہیں، جیسے جامع ترمذی، سنن ابوداود، اور سنن نسائی کی حدیثیں ہیں کہ ان کے مؤلفین کا

وثوق، عدالت، حفظ وضبط اور فنِ حدیث میں تبحر مشہور ہے، اور ان کے مؤلفین نے ان کتابوں میں تساہل اور تسامح کو ہرگز روا نہیں رکھا ہے، اور جہاں تک ہوسکا حدیث کی حالت اور علت بیان کردی ہے، اسی لیے علمائے اسلام میں انہیں شہرت حاصل ہے، اور ان چھ کتابوں کو صحاح ستہ (چھ صحیح کتابیں) کہتے ہیں۔

ابن الاثیر نے "جامع الاصول" میں انہیں چھ کتابوں کی حدیثوں کو جمع کیا ہے، اور الفاظِ غریبہ کی شرح کی ہے، مشکلات کو ضبط کیا ہے، راویانِ حدیث کے ناموں اور دیگر متعلقات کو بھی وضاحت سے بیان کیا ہے، اس لحاظ سے گویا "جامع الاصول" ان چھ کتابوں کی شرح ہے، جیسے "مشارق الانوار" ان تینوں کتابوں (موطأ، اور صحیحین) کی شرح ہے۔

صاحب جامع الاصول نے "سننِ ابن ماجہ" کو صحاح میں شمار نہیں کیا ہے، اور "موطأ" کو صحاح میں چھٹی کتاب قرار دیا ہے، اور یہی درست ہے؛ لیکن حضرت والد صاحب (مراد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ) فرماتے ہیں: فقیر کے نزدیک "مسندِ احمد" دوسرے طبقہ میں داخل ہے، اور وہی صحیح حدیث کے سقیم حدیث سے پہچاننے میں اصل ہے، اور مدار کی حیثیت رکھتی ہے، اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ کس حدیث کی اصل ہے اور کس کی اصل نہیں ہے، اگرچہ "مسندِ احمد" میں ضعیف حدیثیں بھی بہت ہیں، جن کا حال بیان نہیں کیا ہے؛ تاہم جو ضعیف حدیثیں "مسند" میں پائی جاتی ہیں وہ ان حدیثوں سے بہتر نظر آتی ہیں جن حدیثوں کی متاخرین نے تصحیح کی ہے، علمائے حدیث وفقہ نے ان کو اپنا پیشوا بنایا ہے، اور درحقیقت "مسند" فنِ حدیث میں ایک رکن اعظم ہے،

اسی طرح ''سنن ابن ماجہ'' گو اس کی بعض حدیثیں نہایت ضعیف ہیں؛ مگر اس کو بھی اسی طبقہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا طبقہ

اس طبقہ میں وہ حدیثیں داخل ہیں جنہیں علمائے متقدمین نے جو امام بخاریؒ و امام مسلمؒ سے پہلے ہوئے ہیں یا جو ان کے معاصر تھے یا جو ان کے بعد ہوئے ہیں، انہوں نے ان حدیثوں کو اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے اور صحت کا التزام نہیں کیا ہے، اور ان کی کتابیں شہرت اور قبولیت میں طبقۂ اولی اور ثانیہ تک پہنچ نہیں سکی ہیں، اگرچہ ان کتابوں کے مؤلفین علوم حدیث میں ماہر اور ثقہ تھے اور ضبط و عدالت کی صفات سے متصف تھے، ان کتابوں میں صحیح، حسن، ضعیف حدیثیں ہی نہیں پائی جاتی ہیں؛ بلکہ بعض ایسی حدیثیں بھی موجود ہیں جن پر موضوع ہونے کا اتہام ہے، اور ان کتابوں کی حدیثوں کے اکثر راوی عدالت کی صفت سے متصف ہیں، بعض مستور الحال اور بعض مجہول ہیں، اور اکثر وہ حدیثیں ایسی ہیں جو فقہا کے نزدیک معمول بہ نہیں ہیں؛ بلکہ اجماع اور امت کا عمل ان کے خلاف ہے، ان کتابوں میں بھی باہم فرق مراتب ہے، بعض کتابیں بعض سے قوی تر ہیں، ان کتابوں کے نام حسبِ ذیل ہیں:

مسندِ شافعی، سننِ ابن ماجہ، مسندِ دارمی، مسندِ ابی یعلی الموصلی، مصنفِ عبدالرزاق، مصنفِ ابی بکر، مصنفِ ابنِ ابی شیبہ، مسندِ عبد بن حمید، مسندِ ابی داود طیالسی، سننِ دارِقطنی، صحیحِ ابنِ حبان، مستدرکِ حاکم، کتبِ بیہقی، کتبِ طحاوی، تصانیفِ طبرانی۔

چوتھا طبقہ

اس طبقہ میں وہ حدیثیں داخل ہیں جن کا قرونِ اولی (دور صحابہ وتابعین) میں نام ونشان نہیں ملتا؛ مگر متأخرین علما نے ان حدیثوں کو نقل کیا ہے ان کے متعلق دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو سلفِ صالحین نے ان کی چھان بین کی ہے اور انہیں اس کی کوئی اصل ملی کہ وہ ان کو روایت کرتے، یا اس کی کوئی اصل تو پائی؛ مگر ان میں علت اور قباحت دیکھ کر روایت سے گریز کیا، بہر حال دونوں صورتوں میں ان حدیثوں پر سے اعتماد اٹھ گیا اور وہ اس قابل نہ رہیں کہ کسی عقیدہ یا عمل کے ثبوت کے لیے انہیں دلیل بنایا جائے، ایسی ہی باتوں کے لیے بعض مشائخ نے کیا خوب کہا ہے ؎

فَإِنْ كُنتَ لَا تَدْرِي فَتِلْكَ مُصِيبَةٌ وَإِنْ كُنتَ تَدْرِي فَالْمُصِيبَةُ أَعْظَمُ

پس اگر تو نہیں جانتا تو یہ بھی مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے تو بہت بڑی مصیبت ہے [۱۲۰]

اس قسم کی حدیثوں نے بہت سے محدثین کو غلطی میں مبتلا کیا ہے، اور ان کتابوں میں حدیثوں کی بکثرت سندیں دیکھ کر دھوکا کھا گئے اور ان کے متواتر ہونے کا حکم لگا بیٹھے، اور جزم ویقین کے مواقع میں طبقۂ اولی اور ثانیہ کی حدیثوں کو چھوڑ کر اس قسم کی حدیثوں کو سند قرار دے کر ایک نیا مذہب بنایا ہے، اس قسم کی احادیث کی کتابیں بڑی تصنیف ہوئی ہیں، چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

کتاب الضعفاء از ابنِ حبّان، تصانیفِ حاکم، کتاب الضعفاء از عقیلی،

(۱۲۰) [طریق الھجرتین وباب السعادتین ص: ۵۳]

کتاب الکامل از ابنِ عدی، تصانیفِ ابنِ مردویہ، تصانیفِ خطیب، تصانیفِ ابنِ شاہین، تفسیرِ ابنِ جریر، فردوسِ دیلمی، (بلکہ ان کی تمام تصانیف) تصانیفِ ابی نعیم، تصانیفِ جوزقانی، تصانیفِ ابن عساکر، تصانیفِ ابوالشیخ، اور تصانیف ابن النجار۔

مناقب ومثالب کے بیان میں اکثر حدیثیں گھڑی گئی ہیں اور صحت میں تساہل سے کام لیا گیا ہے، اسی طرح تفسیر اور اسبابِ نزول کے بیان میں تاریخ اور بنی اسرائیل کے واقعات اور انبیائے سابقین کے قصوں میں، شہروں کے فضائل، کھانے پینے کی چیزیں، اور حیوانات کے تذکرہ میں اکثر موضوع حدیثیں ہیں، طب، ٹونکے، جھاڑ پھونک، عزیمتوں اور دعوات میں اور نوافل کے اجر وثواب میں بھی اس قسم کا واقعہ پیش آتا ہے، ابن الجوزیؒ نے ''کتاب الموضوعات'' میں اس قسم کی بیشتر حدیثوں پر جرح وقدح کی ہے، اوران کے موضوع ہونے کے دلائل پیش کیے ہیں، اور ''کتاب تنزیہ الشریعہ'' ایسی حدیثوں کی نشاندہی کے لیے کافی ہے۔

اکثر شاذ ونادر مسائل جیسے رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کا اسلام لانا، یا حضرت عباسؓ سے پیروں پر مسح کرنے کی روایتیں، یا انہی جیسے شاذ ونادر مسائل انہی کتابوں کی حدیثوں سے نکلے ہیں، اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ کے رسائل ونوادر کا سرمایہ یہی کتابیں ہیں؛ لہذا ان کتابوں کی حدیثوں میں مشغول رہنا اوران سے احکام کا استنباط کرنا مفید کام نہیں ہے۔

اس پر بھی اگر کسی کے دل میں ان کتابوں کی تحقیق کی خواہش ہوتو ان

حدیثوں کے راویوں کا پتہ چلانے کے لیے علامہ ذہبیؒ کی کتاب "میزان الاعتدال" اور ابن حجر عسقلانیؒ کی "لسان المیزان" اس کے کام آسکتی ہے، الفاظِ غریبہ کی شرح اور مادوں کی تحقیق اور احادیث کی توجیہات کے لیے شیخ محمد طاہر بوہرہ گجراتیؒ کی کتاب "مجمع البحار" سب سے بے پرواہ کردیتی ہے[۱۲۶]۔

قرآن۔حدیث۔فقہ۔

حدیث شریف قرآن کی تفسیر ہے اور فقہ کا متن ہے، گویا کہ حدیث شریف شرح بھی ہے اور متن بھی ہے، شرح اس طریقہ سے ہے کہ باری تعالی نے دو باتوں کی ذمہ داری لی ہے:

۱: اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَقُرۡاٰنَہٗ۔ ۲: ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ[۱۲۷] اس ذمہ داری سے معلوم ہوا کہ جب تک اللہ تعالی نہ بتاتے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی معلوم نہیں ہوتا، اور اگر اس کلام کی عظمت وجلالت پر باری تعالی پردہ نہ ڈالتے تو تحمل کسی کے بس میں نہیں تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلام دوسرے عالم کا ہے، دنیا میں ملکوں کے بدلنے سے زبانیں بدلتی ہیں اور تلفظ دشوار ہوجاتا ہے، اور یہ تو دوسرے عالم کا کلام ہے، اس لیے آسانی ملحوظ رکھتے ہوئے حضرات انبیا کو وحی کے نزول سے قبل عالمِ بالا سے تعلق کی مشق کروائی جاتی ہے، جیسے عالمِ بالا کے تصرفات سے خواب کا آنا، فرشتوں سے انسیت پیدا کرنے کے لیے

---

[۱۲۶] [فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ، از ص ۳۴ تا ص ۳۸]

[۱۲۷] یقین رکھو کہ اس کو یاد کرانا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے ...... پھر اس کی وضاحت بھی ہماری ذمہ داری ہے۔] سورۂ قیمۃ، آیت نمبر: ۱۷و۱۹، پ: ۲۹]

روشنی کا نظر آنا، وغیرہ[130]۔

الغرض اس قرآن کا صحیح مصداق و معنی جب تک رسول نہ بتائے معلوم نہیں کر سکتے تھے، جیسے رکوع وسجود کی کیفیت وغیرہ؛ لہٰذا قرآن کی تشریح فعلِ رسول سے ہوئی، معلوم ہوا قرآن وحدیث کا تعلق ایسا ہے جیسے جڑ اور تنا، قرآن جڑ ہے اور حدیث شریف تنا ہے، اور اس تنے پر جو شاخیں اور پتے لگے وہ فقہ ہیں، خلاصۂ کلام میں قرآن کے بغیر حدیث اور حدیث کے بغیر فقہ بے بنیاد ہیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ وہ حیثیت کو نہیں دیکھتے؛ بلکہ عمل کی طرف متوجہ ہوتے تھے، بعد میں جب امت میں کاہلی اور تعیّش میں اضافہ ہوا تو فقہا نے اعمال کی حیثیات مرتب کیں، مثلاً واجب، مستحب وغیرہ، اور سیاق وسباق کو دیکھ کر جو قوانین تیار کیے اسی کو ''اصول فقہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تقلید ائمہ کیوں؟

قرآن وحدیث- جو کہ احکام کے لیے سرچشمہ ہیں- میں بعض وہ احکام ہیں جو بالکل واضح اور صریح ہیں، ان میں کوئی تعارض اور اجمال نہیں، اس لیے ان مسائل میں اجتہاد کا سوال نہیں؛ البتہ بعض وہ مسائل ہیں جن میں اجمال وتعارضِ ادلہ ہے، جیسے قرآن کریم میں لفظ ''قُرُوْء''[131] استعمال ہوا ہے لغت میں اس کے معنی حیض اور طہر دونوں ہیں، اب ایسے موقع پر انسان یا تو خود اپنی رائے اور ارادہ سے کوئی فیصلہ کر کے اس پر عمل کر لے یا یہ کہ اسلاف میں جس کے علم اور تفقہ پر اعتماد ہو ان کے فیصلہ پر عمل کیا جاوے، پہلی صورت تو نہایت

---

(۱۳۰) [علوم القرآن، ص ۳۸]

(۱۳۱) [سورۂ بقرہ، آیت نمبر: ۲۲۸، پ: ۲]

خطرناک، اتباعِ ہویٰ سے لبریز ہے، اس میں گمراہی غالب ہے؛ البتہ دوسری صورت کہ اسلاف میں سے جس کا تقوی، علم، تفقہ ہم سے بہت آگے ہو اور دورِ رسالت سے قریب تر زمانہ جس نے پایا ہو ان کی پیروی کرنا، اسی کو دوسرے لفظوں میں تقلیدِ ائمہ سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ پُرامن راستہ ہے، چونکہ ان اسلاف کی قوتِ حفظ، علم وفضل، روایات پر وسعتِ نظر، نزولِ قرآن کا زیادہ ماحول، سنت کے ارشادات کا پس منظر اور کلامِ عرب کی صحیح واقفیت ہم سے کئی گنا زیادہ تھی؛ نیز حقائق ومعارف کے انکشاف کے لیے جس تقوی کی ضرورت ہوتی ہے ان میں بطریقۂ اتم تھا، اس لیے ان کے فیصلوں پر عمل ہی زیادہ مناسب ہے۔

شروط الائمۃ الستۃ

شروط الائمہ: حضرات ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں کے بارے میں شرائط کی کوئی وضاحت نہیں کی؛ البتہ بعد والوں نے اس میں غور وفکر کر کے شرائط کی تعیین کی ہے، اس موضوع پر علامہ حازمیؒ کا رسالہ کافی وشافی ہے[۱۳۲]۔

ملخصاً یہ بات سمجھنی چاہئے کہ دو چیزیں بنیادی طور پر ملحوظ ہوتی ہیں:

[۱] راوی کی ذات۔ [۲] اپنے شیخ سے تعلق۔

ان دونوں باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کل پانچ صورتیں نکلتی ہیں:

[۱] حفظ واتقان میں غایت درجہ (یعنی انسان کے لیے جس درجہ کا حفظ سن

(۱۳۲) علامہ ابوبکر حازمیؒ کا رسالہ "شروط الائمۃ الخمسۃ" قاہرہ سے ۱۳۵۷ھ میں علامہ کوثریؒ کی تعلیقات کے ساتھ شائع ہو چکا ہے، انتہائی مفید اور مطالعہ کے لئے ناگزیر ہے، علامہ حازمیؒ نے ص ۴۴ پر ان شرائط کو بیان کیا ہے۔ [درس ترمذی: ۱/ ۷۶]

ہوئی احادیث کو محفوظ رکھنا، اور اس کو صاف شفاف لکھنا ہو سکے، اس کا اہتمام کرنا) مع طول الملازمۃ للشیخ، جیسے امام مالکؒ، امام سفیان بن عیینہؒ وغیرہ۔

[۲] حفظ واتقان میں غایت درجہ؛ البتہ صحبت شیخ میں کمی ہوئی ہو جیسے امام لیث بن سعد مصری۔

[۳] ضبط واتقان میں کمی آئے؛ لیکن شیخ کی صحبت میسر رہی۔

[۴] ضبط واتقان اور صحبت شیخ دونوں میں کمی آئے۔

[۵] الضعفاء والمجاہل، ضعیف تو وہ جس کو ساری دنیا جانتی ہو؛ لیکن احوال کمزور ہوں، اور مجہول جس کے احوال ہی معلوم نہ ہوں۔

امام بخاریؒ عامتاً اصول میں (یعنی جو روایت حَدَّثَنَا کہہ کر لاتے ہیں) اول درجہ کی روایت لاتے ہیں، اور متابعۃ میں (یعنی تابعہ فلان ابن فلان) دوسرے درجہ والے کی روایت بھی لاتے ہیں، اور ترجمۃ الباب میں تیسرے درجہ تک کے راویوں کی روایت بھی لیتے ہیں۔

امام مسلمؒ کے یہاں ابواب معہود ذہنی ہیں، کیف ما اتفق روایات کو جمع نہیں کیا ہے، اصول میں اول اور دوسرے درجہ کے راویوں سے روایت لیتے ہیں؛ البتہ متابعات میں یعنی جب نحوہ یامثلہ کہہ کر حدیث کی دوسری سند پیش کرتے ہیں، یا اس حدیث کے متعلق کسی چیز کو نقل کرنے کے لیے مستقل سند سے روایت لاتے ہیں، تب تیسرے درجہ کی روایت بھی لے لیتے ہیں، خلاصۂ کلام میں یہ دونوں حضرات تین ہی درجہ کے راویوں کی روایت کو لیتے ہیں۔

امام ابوداود اول، دوم، سوم تین درجہ کے رایوں کی روایت لاتے ہیں اور ضرورت کے وقت چوتھے درجہ کے راوی سے بھی روایت لیتے ہیں، اور وہاں

قال ابو داود کہہ کر تصفیہ کی سعی کرتے ہیں۔

امام نسائیؒ یہ جرح وتعدیل میں ’’ترمذی‘‘ اور ’’ابوداود‘‘ سے بھی اونچے ہیں، اپنی کتاب میں عامتاً اول، دوم، سوم درجہ کے راویوں سے روایت لیتے ہیں، دوسری کتابوں میں ان کے اقوالِ جرح وتعدیل بکثرت آتے ہیں؛ لیکن خود کی کتاب میں نہیں۔

امام ترمذیؒ نے اول، دوم، سوم، چہارم درجے کے راویوں کی روایت عامۃً لی ہیں، اور بوقت ضرورت پانچویں درجہ کے راوی سے بھی روایت لیتے ہیں، اور وہاں نقد کرتے ہیں، تمام احادیث پر انہوں نے حکم اپنی تجویز کردہ اصلاح کے مطابق لگا ہی دیا ہے؛ تاکہ پڑھنے والے کو حدیث شریف کا درجۂ ثبوت معلوم ہوجائے، یہ کل پانچ حضرات ہوئے۔

نمبر چھ کے سلسلہ میں امت میں کافی اختلاف رہا، پہلے ایک زمانہ تک صحاحِ ستہ میں ’’مؤطا امام مالک‘‘ بھی شامل تھی، پھر ایک زمانہ وہ آیا جس میں صحاح ستہ میں ’’سننِ دارمی‘‘ کا شمار ہونے لگا، اس کے بعد سب سے پہلے شیخ ابن طاہر مقدسیؒ نے ’’ابنِ ماجہ‘‘ کو صحاحِ ستہ میں شامل کیا، پھر ہمارے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے تجدید کی اور ’’ابنِ ماجہ‘‘ کو بھی شامل فرمایا، اس لیے ’’ابنِ ماجہ‘‘ کے رواۃ پر عامتاً زیادہ بحث وتحقیق نہیں ہوئی؛ البتہ غور وخوض سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن ماجہؒ عامتاً پانچوں اقسام کے راوی کی روایت لیتے ہیں، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ راویوں کے سلسلہ میں امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے بعد امام نسائیؒ کا مقام ہے، پھر امام ابوداوٗدؒ، پھر امام ترمذیؒ اور پھر امام ابن ماجہؒ۔

چوتھا باب

تقسیمِ حدیث

تقسیمِ حدیث

حدیث دو قسم پر ہے:

[۱] متواتر۔ [۲] خبر واحد۔

تعریف متواتر: خبر متواتر وہ حدیث ہے جس کے روایت کرنے والے ہر زمانہ میں اس قدر کثیر ہوں کہ ان سب کے جھوٹ پر اتفاق کرنے کو عقلِ سلیم محال سمجھے۔

خبرِ واحد: خبرِ واحد وہ حدیث ہے جس کے راوی اس قدر کثیر نہ ہوں۔

اقسام خبرِ واحد

خبرِ واحد مختلف اعتبار سے کئی قسموں پر ہے:

خبر واحد کی پہلی قسم

خبرِ واحد اپنے منتہی کے اعتبار سے تین قسم پر ہے:

[۱] مرفوع۔ [۲] موقوف۔ [۳] مقطوع۔

تعریفِ مرفوع: مرفوع وہ حدیث ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول یا فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔

تعریفِ موقوف: وہ حدیث ہے جس میں صحابی کے قول یا فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔
تعریفِ مقطوع: وہ حدیث ہے جس میں تابعی کے قول یا فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔

خبرِ واحد کی دوسری قسم

خبرِ واحد عددِ رواۃ کے اعتبار سے تین قسم پر ہے:

[۱] مشہور۔ [۲] عزیز۔ [۳] غریب۔

تعریفِ مشہور: مشہور وہ حدیث ہے جس کے راوی ہر زمانے میں تین سے کم نہ ہوں۔
تعریفِ عزیز: عزیز وہ حدیث ہے جس کے راوی ہر زمانہ میں دو سے کم کبھی نہ ہوں۔
تعریفِ غریب: غریب وہ حدیث ہے جس کے راوی کہیں نہ کہیں ایک ہو۔

خبرِ واحد کی تیسری تقسیم

خبرِ واحد اپنے راویوں کی صفات کے اعتبار سے سولہ قسم پر ہے:

[۱]: صحیح لذاتہ۔ [۲]: حسن لذاتہ۔ [۳]: ضعیف۔ [۴]: صحیح لغیرہ۔ [۵]: حسن لغیرہ۔ [۶]: موضوع۔ [۷]: متروک۔ [۸]: شاذ۔ [۹]: محفوظ۔ [۱۰]: منکر۔ [۱۱]: معروف۔ [۱۲]: معلل۔ [۱۳]:

مضطرب۔ [۱۴]: مصحف۔ [۱۵]: مقلوب۔ [۱۶]: مدرج۔

(۱) تعریف صحیح لذاتہ: وہ حدیث ہے جس کے کل راوی عادل، کامل الضبط ہوں اوراس کی سند متصل ہونے کے ساتھ معلل اور شاذ ہونے سے محفوظ ہو۔

(۲) حسن لذاتہ: وہ حدیث ہے جس کے راوی میں صحیح لذاتہ کے راوی سے ضبط کم درجہ کا ہو، باقی سب شرائط صحیح لذاتہ کے ہیں۔

(۳) ضعیف: وہ حدیث ہے جس کے راوی میں صحیح اور حسن کے شرائط نہ پائے جائیں۔

(۴) صحیح لغیرہ: اس حدیث حسن لذاتہ کو کہا جاتا ہے جس کی سندیں متعدد ہوں۔

(۵) حسن لغیرہ: اس حدیثِ ضعیف کو کہا جاتا ہے جس کی سندیں متعدد ہوں۔

(۶) موضوع: وہ حدیث ہے جس کے راوی میں حدیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں جھوٹ بولنے کا طعن موجود ہو۔

(۷) متروک: وہ حدیث ہے جس کا راوی متہم بِالکذِب ہو، یا وہ روایت قواعد معلومہ فی الدین کے خلاف ہو۔

(۸) شاذ: وہ حدیث ہے جس کا راوی خود ثقہ ہو؛ مگر ایک ایسی جماعت کی مخالفت کرتا ہو جو اس سے زیادہ ثقہ ہو۔

(۹) محفوظ: وہ حدیث ہے جو شاذ کے مقابل ہو۔

(۱۰) منکر: وہ حدیث ہے جس کا راوی باوجود ضعیف ہونے کے جماعت ثقات کے مخالف روایت کرے۔

(۱۱) معروف: وہ حدیث ہے جو منکر کے مقابل ہو۔ (یعنی ثقات کی حدیث)

(۱۲) مضطرب: وہ حدیث ہے جس کی سند یا متن میں ایسا اختلاف ہو کہ اس میں ترجیح یا تطبیق نہ ہو سکے۔

(۱۳) مقلوب: وہ حدیث ہے جس میں راوی نے بھول سے متن یا سند میں تقدیم یا تاخیر کردی ہو، یعنی لفظ مقدم کو مؤخر، اور مؤخر کو مقدم کردیا ہو، یا ایک راوی کی جگہ دوسرے راوی کا نام رکھ دیا ہو۔

(۱۴) مصحف: وہ حدیث ہے جس میں باوجود صورت خطی باقی رہنے کے لفظوں، حرکتوں وسکونوں کے تغیر کی وجہ سے لفظ میں غلطی واقع ہو جائے، کبھی تصحیف راوی میں ہوتی ہے جیسے شعبہ کی وہ حدیث جس کو انہوں نے عوام بن مراجم (بالراء والجیم) سے نقل کیا ہے، اس کو یحیی بن معینؒ نے غلطی سے مراجم کے بجائے مزاحم (بالزاء والحاء) ذکر کیا ہے۔

کبھی تصحیف حدیث میں ہوتی ہے جیسے حدیث میں "من صام رمضان و اتبعه ستاً من الشوال" کو بعض راوی نے "شیئا (بالشین المعجمة) ذکر کیا ہے۔

(۱۵) مدرج: وہ حدیث ہے جس میں کسی جگہ راوی نے اپنا کلام درج کیا ہو۔

(۱۶) معلل: وہ حدیث ہے جس میں کوئی ایسی چھپی ہوئی بیماری ہو جس کو کوئی ماہرِ فن ہی جان سکتا ہے۔

خبرِ واحد کی چوتھی تقسیم

خبرِ واحد سقوط وعدمِ سقوطِ راوی کے اعتبار سے سات قسم پر ہے:

[۱]: متصل۔ [۲]: مسند۔ [۳]: منقطع۔ [۴]: معلق۔ [۵]: معضل۔

[۶]: مرسل۔ [۷]: مدلس۔

(۱) متصل: وہ حدیث ہے جس کی سند میں سارے راوی مذکور ہوں کوئی راوی حذف نہ ہو۔

(۲) مسند: وہ حدیث ہے کہ اس کی سند آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک متصل ہو۔

(۳) منقطع: وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان میں راوی گرا ہوا ہو۔

(۴) معلق: وہ حدیث ہے جس کی سند کے شروع سے ایک یا زیادہ راوی گرے ہوئے ہوں۔

(۵) معضل: وہ حدیث ہے جس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی پے در پے گرے ہوئے ہوں۔

(۶) مرسل: وہ حدیث ہے جس کی سند کے آخر سے کوئی راوی گرا ہوا ہو، یعنی صحابہ۔

(۷) مدلس: وہ حدیث ہے جس کی روایت میں راوی نے اپنے شیخ یا شیخ کے شیخ کا نام چھپا دیا ہو۔

خبرِ واحد کی پانچویں تقسیم

خبرِ واحد صیغۂ ادا کے اعتبار سے دو قسم پر ہے:

[۱] معنعن۔ [۲] مسلسل۔

(۱) معنعن: وہ حدیث ہے جس کی سند میں لفظ ''عن'' ہو اس کو ''معنعنہ'' کہا جائے گا۔

معنعن کے متصل ہونے کی شرط: اگر راوی کی مروی عنہ سے ملاقات ممکن ہو اور راوی تدلیس سے بری ہو، ایسے راوی کے ''عن'' کو متصل مانا جائے گا،

اس کو امام مسلمؒ نے ترجیح دی ہے۔

اور امام بخاریؒ کے نزدیک کم از کم ایک مرتبہ راوی کی مروی عنہ سے ملاقات ثابت ہو تب اس کو متصل مانا جائے گا، اس مسئلہ کو امام مسلمؒ نے مقدمہ میں رد کر دیا ہے، اور ترجیح میں لہجہ تیز تر ہو گیا ہے[۱۳۳]۔

(۲) مسلسل: وہ حدیث ہے جس کو تمام راویوں نے شروع سے لے کر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ایک حالت پر بیان کیا ہو، مثلاً تمام راویوں نے اول سے آخر سند تک سمعت فلانا یقول ذکر کیا یا أخبرنا فلان واللہ قال أخبرنا فلان واللہ اخیر تک سبھی نے یہی لفظ ذکر کیا ہو، اس کو مسلسلِ قولی کیا جاتا ہے، اور کبھی تسلسل فعلی ہوتا ہے، جیسے حدیث مسلسل بضیافة الأسودین (ماء وتمر) کے ہر راوی نے بعد کے شاگرد کو ماء وتمر (یعنی زمزم و کھجور) دیا[۱۳۴] اور کبھی تسلسل قولاً وفعلاً دونوں طرح ہوتا ہے، جیسے حدیث: اَللّٰھُمَّ أَعِنِّی عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ۔

ترجمہ: اے اللہ! میری مدد کر کہ میں تیرا ذکر کروں، تیرا شکر ادا کروں، اور تیری عبادت اچھی طرح کروں۔

ابوداؤد، مسندِ احمد، اور نسائی کی روایت میں ہے کہ راوی نے کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ مجھے تم سے محبت ہے ہر نماز کے بعد

---

(۱۳۳) دیکھیے: [فیض المنعم شرح مقدمۂ مسلم" ص: ۱۳۷]

(۱۳۴) یہ ترمذی کی روایت ہے کہ ہر راوی نے اپنے شاگرد کو کھجور کھلائی اور پانی پلایا اور پھر یہ حدیث سنائی: الراحمون یرحمهم الرحمن، إرحموا من في الارض یرحمکم من في السماء [ترمذی: ۲/ ۱۴ باب جاء في رحمة الصبیان، أبواب البر والصلة]

کہا کرو: اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلىٰ ذِكْرِكَ الخ دیکھو اس حدیث میں ہاتھ پکڑنا فعل ہے اور قل کہہ کر تلقین کرنا قول ہے، ان دونوں کا اہتمام راویوں نے کیا ہے[۱۳۵]۔

عمرو بن شعیب والی روایت کی تحقیق

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده والی سند کی تحقیق

نسب: عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص۔

عمرو: صدوق، صغار تابعین میں آپ کا شمار ہے، آپ کی وفات ۱۱۸ھ میں ہوئی، امام بخاریؒ نے قدر کے ضمن میں آپ سے روایت لی ہے[۱۳۶] ان کے علاوہ مؤلفینِ سننِ اربعہ بھی آپ سے روایت کرتے ہیں، عن ابیه ای شعیب صدوق اپنے دادا اور کبارِ تابعین سے سماع ثابت ہے، مذکورہ بالا حضرات نے آپ سے روایت لی ہے، عن جدّہ یعنی باپ کے دادا، اس ضمیر کا مرجع شعیب ہے عمرو نہیں، اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہیں، علامہ سیوطی ''دارِ قطنی'' کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے ابو بکر نقاش کو سنا وہ کہتے تھے کہ عمرو بن شعیب تابعی نہیں ہیں؛ لیکن ان سے بیس

---

[۱۳۵] [ابو داود، باب فی الاستغفار، کتاب الوتر، رقم الحدیث ۱۵۲۲]
(نوٹ) اصطلاحات حدیث اور ان کی تعریفات کے لیے دیکھیے: [نخبۃ الفکر، مقدمۂ مشکوۃ، مظاہر حق، مقدمۂ اعلاء السنن، نزھۃ النظر، تدریب الراوی، توجیہ النظر، خیر الاصول فی حدیث الرسول وغیرہ]

[۱۳۶] عمرو بن شعیب کی کوئی روایت بخاری شریف کے ''باب القدر'' یا کسی اور باب میں نہیں ملی، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: فلیس فیهما (ای الصحیحین) لعمرو شیئ [تہذیب التہذیب ج: ۸ العین: ۸۰ عمرو ص: ۵۲]
ہاں! امام بخاریؒ نے ''جزء القراءت خلف الامام'' میں عمرو بن شعیب سے متعدد روایتیں لی ہیں۔

[۲۰] تابعین نقلِ روایت کرتے ہیں، امام دارِقطنی فرماتے ہیں کہ جب اس امر کی میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بیس سے بھی زائد حضرات ان سے روایت نقل کرتے ہیں، ابن صلاح فرماتے ہیں کہ میں نے حافظ ابوموسی کے قلم سے لکھی ہوئی بات پڑھی کہ عمرو بن شعیب تابعی نہیں ہیں؛ لیکن ستر [۷۰] سے زیادہ تابعین ان سے نقل کرتے ہیں۔

حقیقت میں یہ سب وہم ہے، چونکہ عمرو بن شعیب دو صحابیہؓ سے نقل کرتے ہیں:

[۱] ربیع بنت معوذ بن عفراءؓ [۲] زینب بنت ابی سلمہؓ (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ربیبہ)

معلوم ہوا کہ عمرو بن شعیب تابعی ہیں۔

محدثین اس میں اختلاف کرتے ہیں عمرو بن شعیب عن أبیه عن جدّه والے نسخہ سے احتجاج صحیح ہے یا نہیں؟ محقق قول یہی ہے کہ مطلقا نقل صحیح ہے [۱۳۰]، اور یہ محمد جو سند میں مذکور ہے ایک حدیث کے علاوہ ان سے کوئی بات مروی نہیں، اور وہ حدیث ابن الهاد سے ابن حبانؒ نے روایتاً نقل کی ہے عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن محمد بن عبد الله عن عبد الله بن عمرو مرفوعا: ألا أخبركم بأحبكم إلي وأقربكم مني مجلسا يوم القيامة [۱۳۱]۔

---

[۱۳۰] دیکھیے: [ترمذی، کتاب الزکوۃ، باب ما جاء فی زکوۃ مال الیتیم۔ معارف السنن: ۵/ ۲۳۷۔ نصب الرایۃ: ۲/ ۳۳۲۔ درسِ ترمذی: ۲/ ۴۶۰]

[۱۳۱] [ابنِ حبان: ۱/ ۳۵۲]

عن ابن عباس رضي الله عنهما قال:
قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم:
(اللهم ارحم خلفائي, قلنا: يا رسول الله
ومن خلفاؤك ؟ قال: الذين يروون أحاديثي
ويعلمونها الناس), رواه الطبراني في
الأوسط.

پانچواں باب

مقدمة الكتاب

مقدمۃ الکتاب

امرِ اول: غرض

جیسا کہ علمِ حدیث کی غرض وغایت ہوتی ہے ایسے ہی کتاب کی بھی غرض وغایت ہوتی ہے، چنانچہ صاحبِ مشکوۃ شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب تبریزیؒ کی غرض اس کتاب سے یہ ہے کہ علامہ محی السنۃ ابومحمد حسین بن مسعود الفراء بغویؒ نے علمِ حدیث میں ایک کتاب ''مصابیح'' نامی تصنیف فرمائی تھی جس میں مؤلف نے تمام اہم احادیث- جس کا جاننا ایک طالب آخرت کے لیے ضروری ہو- کو جمع کر دیا؛ لیکن مؤلفِ مصابیح نے اختصار کی نیت سے ان احادیث کی اسانید کو حذف کر دیا تھا، تو بعض ناقدین نے ان پر سخت کلام کیا ، حالانکہ مؤلفِ مصابیح خود ثقاتِ علما میں سے ہونے کی وجہ سے ان کا نقل کرنا ہی سند کی حیثیت رکھتا ہے؛ لیکن پھر بھی ان کی نشاندہی میں جو بات ہے وہ ان کو بے حوالہ چھوڑنے میں نہیں، اس لیے مؤلفِ مشکوۃ نے ان احادیث کا حوالہ بھی بیان کر دیا اور ان میں کچھ اضافہ بھی اپنی طرف سے فرمایا، یہ ہے کتاب ''مشکوۃ'' کی غرض[۱۳۹]۔

---

(۱۳۹) مصنفؒ کے استاذ علامہ حسین بن عبداللہ بن محمد طیبیؒ نے آپ کو اس کام کے لئے آمادہ کیا کہ روایات کی تخریج کریں، اور ماخذ بیان کریں، اور ہر روایت کے ساتھ صحابیؓ کا نام بھی لکھیں [مقدمۂ شرح الطیبی الکاشف عن حقائق السنن ۱: ۳۴]

امرِ ثانی: وجہِ تسمیہ

اس کتاب کا نام ہے ''مشکوۃ المصابیح''۔ مشکوۃ: لغت میں اس طاق کو کہتے ہیں جس میں چراغ رکھا جائے، اور مصابیح جمع ہے مصباح کی، تو اس کتاب کا نام مشکوۃ اس لیے رکھا گیا کہ جب طاق میں نور مجتمع ہوتا ہے تو اس میں قوت آتی ہے، بخلاف اس کے اگر کھلی جگہ میں چراغ رکھا جائے تو نور میں وہ قوت نہ ہوگی، اسی طرح احادیث کے رواۃ کا نام جب تک معلوم نہ ہو وہ منتشر ہوگی اور جب راوی کا نام معلوم ہو جائے تو وہ منضبط ہوگی، یہ وجہِ تسمیہ تو علامہ طیبیؒ نے بتلائی ہے [۱۶۰]، اور علامہ میرکؒ نے وجہ تسمیہ یہ بتلائی ہے کہ مشکوۃ یہ مصابیح کی احادیث کو گھیرے ہوئے اور اپنے اندر لیے ہوئے ہے، جیسا کہ طاق اپنے اندر چراغ کو لیے ہوئے ہوتا ہے اور گھیرے ہوتا ہے، ایک تیسری وجہ ملا علی قاریؒ نے بیان فرمائی ہے کہ مصابیح سے مراد وہ تمام احادیث ہیں جو اس کتاب میں مذکور ہیں، چاہے وہ محی السنۃؒ کی ''المصابیح'' سے لی ہوں یا اس کے علاوہ سے، اور ان احادیث کو مصابیح سے تعبیر اس لیے کیا کہ یہ نورانی نشانیاں اور واضح علامتیں ہیں جو سید الانبیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے سینۂ مبارک سے ظاہر ہوئیں؛ تا کہ اس کے ذریعہ آپ کی امت گمراہی کے جنگل اور جہالت کے صحرا میں راہ حاصل کر لے، چنانچہ اسی معنی میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ''أصحابی کالنجوم بأیھم اقتدیتم اھتدیتم'' [۱۶۱] کہا گیا ہے، اور چونکہ ان کی یہ کتاب ان احادیث کو- جو مصابیحِ ہدایت ہیں- جامع تھی اس لیے اس

---

(۱۶۰) [حوالۂ سابق: ۱/ ۸۸]

(۱۶۱) [مشکوۃ ص ۵۵۴، باب مناقب الصحابۃ]

کو ''مشکوۃ'' سے تشبیہ دی [۱۳۲]۔

امرِ ثالث: مؤلفِ کتاب

چونکہ مشکوۃ، المصابیح ہی میں اصلاح واضافہ کر کے تیار ہوئی ہے، اس لیے گویا ''المصابیح'' اس کی اساس وبنیاد ہے؛ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے صاحب مصابیح کے حالات ذکر کیے جائیں، اس کے بعد صاحب مشکوۃ کے۔

مؤلف المصابیح: نام حسین، کنیت ابو محمد، لقب محی السنۃ، والد کا نام مسعود، اور دادا کا نام محمد ہے، فراء بغوی کے نام سے مشہور ہیں، اور ابن الفراء بھی کہلاتے ہیں، آپ ۴۳۵ھ میں پیدا ہوئے، عربی میں فرو، پوستین کو کہتے ہیں، ان کے والد پوستین بنایا کرتے تھے، اس لیے آپ کو فراء اور ابن الفراء کہا جاتا ہے [۱۳۳]، بغوی یہ ان کے وطن ''بغو'' کی اصل ''بغشور'' ہے جو باغ کور کا معرب ہے، یہ شہر ہرات اور مرو کے درمیان واقع ہے، شور کو حذف کر کے بغوی

---

(۱۳۲) [مرقاۃ: ۱/ ۳۷]

وللہ در من قال من ارباب الحال

لَئِنْ کَانَ فِی الْمِشْکٰوۃِ یُوْضَحُ مِصْبَاحٌ فَذَالِکَ مِشْکٰوۃٌ وَ فِیْھَا مَصَابِیْحُ

وَفِیْھَا مِنَ الْاَنْوَارِ مَا شَاعَ نَفْعُھَا لِھٰذَا عَلٰی کُتُبِ الْاَنَامِ تَرَاجِیْحُ

فَفِیْہِ اُصُوْلُ الدِّیْنِ وَ الْفِقْہِ وَالْھُدٰی حَوَائِجُ اَھْلِ الصِّدْقِ مِنْہُ مَنَاجِیْحُ

یعنی اگر عام طاقچوں میں صرف ایک ایک چراغ ہوتا ہے، سو یہ ایسا طاقچہ ہے جس میں کئی چراغ موجود ہیں۔
اور اس میں ایسے انوار ہیں جن کی افادیت عام ہو چکی ہے، اس کتاب کو دیگر حضرات کی کتابوں پر گونا گوں ترجیحات حاصل ہیں۔
چنانچہ اس میں اصولِ دین، فقہ اور ہدایت سب کچھ ہے، اور تمام اہل صدق کی دینی حاجات اس سے بہ خوبی پوری ہوتی ہیں۔

(۱۳۳) ایک فراء نحوی بھی مشہور ہیں؛ مگر وہ اور ہیں۔

طرف نسبت کی تو بغوی ہوگیا، (یہ لفظ ثنائی ہے؛ مگر زیادتِ واؤ کی وجہ سے ثلاثی ہوگیا) (۱۰۴)۔

آپ اپنے زمانہ کے مشہور محدث ومفسر اور بلند پایہ قرّاء میں سے تھے (۱۰۵)، فقہ میں قاضی حسین بن محمدؒ کے شاگرد ہیں، اور شافعی المسلک ہیں، اور حدیث میں ابوالحسن عبدالرحمن بن محمد داودیؒ کے شاگرد ہیں، جو زمرۂ محدثین میں داخل ہیں، عبدالواحد صیرفی، علی بن یوسف جوینی سے بھی کافی استفادہ کیا ہے، تمام عمر تصنیف وتالیف اور حدیث وفقہ کے درس میں مشغول رہے، ہمیشہ باوضو درس دیتے، اور زہد وقناعت میں زندگی گذارتے تھے، افطار کے وقت خشک روٹی کے ٹکڑے پانی میں تر کرکے کھاتے تھے، جب لوگوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ خشک روٹی کھانے سے دماغ میں خشکی پیدا ہوجائے گی تو سالن کے طور پر روغنِ زیتون استعمال کرنے لگے تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کی بیوی کا انتقال ہوا اور کافی مال چھوڑ کر وفات پائی؛ لیکن آپ نے ان کی میراث میں سے کوئی چیز نہیں لی۔

جب آپ نے "شرح السنة" تصنیف کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے ہیں: تو نے میری احادیث کی شرح کرکے

---

(۱۰۴) "بغی" کے بجائے "بغوی" واو کے اضافہ سے نسبت کی گئی، چونکہ "بغی" کے معنی زانیہ کے ہیں، اس لیے التباس سے بچنے کے لئے اسماء محذوفۃ الاعجاز کا قاعدہ جاری کردیا گیا ہے، جیسے "دم" سے "دموی" "اب" سے "ابوی" اور "اخ" سے "اخوی" بنایا جاتا ہے اور واو کا اضافہ کردیا جاتا ہے [اشعۃ اللمعات:۱/۲۶۔ مرقاۃ:۱/۱۱۔ نفحات:۱/۵۹]

(۱۰۵) ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کان مفسراً، محدثاً، فقیهاً وکان ماهراً فی علم القرأة. [مرقاۃ:۱/۱۰]

میری سنت کو زندہ کر دیا، اسی دن سے آپ کا لقب محی السنۃ مشہور ہو گیا۔

ماہِ شوال میں بمقام ''مرو'' وفات پائی اور اپنے استاذ قاضی حسینؒ کے پاس مقبرۂ طالقانی میں مدفون ہوئے، وہاں آپ کی قبر مشہور و معروف ہے، عمر اسیؔ سال سے متجاوز تھی[۱۳۹]۔

آپ نے متعدد تصانیف فرمائی ہیں: تفسیر میں ''معالم التنزیل''۔ فقہ میں ''ترجمۃ الإحکام'' اور ''تهذیب فتاوی بغویه''۔ حدیث میں ''شرح السنۃ'' ''ارشاد الانوار فی شمائل النبی المختار'' ''الجمع بین الصحیحین'' اور ''المصابیح''[۱۴۰]۔

احادیثِ مصابیح

''المصابیح'' میں [۴۴۸۴] احادیث ہیں[۱۴۱]، بخاری و مسلم سے [۲۴۳۴] اور سنن ابوداود، ترمذی وغیرہ سے [۲۰۵۰] لیکن صاحب کشف الظنون نے احادیث مصابیح کی تعداد بعض حضرات سے نقل کی ہے وہ اس سے مختلف ہے، انہوں نے کل احادیث کی تعداد [۴۷۱۹] بتلائی ہے، جن میں سے [۳۲۵] بخاری کی اور [۸۷۵] مسلم کی اور [۱۰۵۱] متفق علیہ ہیں، اور

---

(۱۳۹) سن وفات ۵۱۶ھ ہے [اشعۃ اللمعات: ۱/ ۲۶۔ معجم البلدان: ۱/ ۴۶۸]

(۱۴۰) [دیکھئے الاعلام للزرکلی: ۲/ ۲۵۹۔ کشف الظنون: ۱/ ۳۹۷ و ۲/ ۱۴۹۹]

(۱۴۱) [بستان المحدثین اردو، ص ۲۲۵] صاحب مرقاۃ نے مصابیح کی احادیث کی تعداد (۴۴۳۴) بتلائی ہیں۔ قیل: احادیثه اربعة آلاف و اربع مائة و اربعة و ثلاثون حدیثا، اس پر صاحب مشکوۃؒ نے (۱۵۱۱) کا اضافہ فرمایا اس طرح مجموعی تعداد (۵۹۴۵) ہوگئی، وزاد صاحب المشکوۃ ألفا و خمس مائة و احد عشر حدیثا، فالمجموع خمسة آلاف و تسعمائة و خمسة و اربعون. [مرقاۃ: ۱/ ۱۰]

باقی دیگر کتب احادیث کی ہیں، صاحب کشف الظنون نے بعض حضرات کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اس کتاب کا نام ''مصابیح'' خود مصنف کا معین کردہ نہیں ہے؛ بلکہ صاحب کتاب نے جو دیباچہ میں کہا ہے کہ ''أما بعد: إن أحاديث هذا الكتاب مصابيح'' اس کی وجہ سے بطورِ غلبہ اس کا نام ''مصابیح'' ہوگیا۔ ''المصابیح'' کی سولہ سے زیادہ شروحات ہیں۔

مؤلّفِ مشکوۃ

نام محمد، کنیت ابوعبداللہ، لقب ولی الدین، اور والد کا نام عبداللہ ہے، نسباً عمری ہیں، اور خطیب تبریزیؒ سے مشہور ہیں، اپنے وقت کے محدث، علامہ، اور فصاحت و بلاغت کے امام تھے، حدیث میں آپ کا امتیازی پایہ ''مشکوۃ'' سے ظاہر ہے، مبارک شاہؒ، صاویؒ وغیرہ آپ کے شاگرد ہیں۔

آپ کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور یہی ''مشکوۃ'' ہے، جس میں صحاح کے علاوہ دوسری کتابوں کی حدیثیں بھی جمع ہیں، یہ نہایت مقبول ومتداول کتاب ہے، ہندوستان میں تو ایک مدت تک ''مشکوۃ'' اور'' مشارق الأنوار'' ہی حدیث کا کمال معراج رہی ہیں، اور اب بھی جبکہ صحاحِ ستہ فنِ حدیث کی تکمیل کے لیے ضروری قرار پاچکی ہے ''مشکوۃ'' بھی دورۂ حدیث سے قبل لازمی ہے؛ کیونکہ کسی زمانہ میں ''مشکوۃ'' کو قرآن کی طرح زبانی یاد کیا جاتا تھا۔

مصابیح میں صرف احادیث مذکور تھیں، راوی کا نام، مخرج حدیث، صحت

وضعف، اور حسن وغیرہ کا تذکرہ نہیں تھا، صاحب مشکوۃ نے جملہ امور بیان کیے اور یہ بھی بتادیا کہ وہ حدیث کس کتاب کی ہے، چنانچہ تیرہ اصحاب حدیث کا خصوصی ذکر کیا: [۱ تا ۶] اصحابِ صحاحِ ستہ، [۷] امام مالک، [۸] شافعی، [۹] احمد، [۱۰] دارمی، [۱۱] دارقطنی، [۱۲] بیہقی، [۱۳] اورابوالحسن رزین۔

پھر صرف صاحب مصابیح کے لکھنے پر اعتماد نہیں کیا؛ بلکہ اصول کی ان تمام کتابوں میں روایات کا اختلاف مقابلہ کر کے نقل کیا ہے، اور جہاں جہاں صاحبِ مصابیح نے احادیث کو غریب یا ضعیف یا منکر قرار دیا ہے موصوف نے اس کا سبب بھی ظاہر کر دیا، صاحبِ مصابیح نے ہر باب کے تحت دو فصلیں قائم کی تھیں۔ فصل اول میں صحیحین کی حدیث لائے ہیں جن کو صحاح کے نام سے تعبیر کیا ہے، اور فصل ثانی میں ابوداؤد، ترمذی، نسائی، وغیرہ کی احادیث لائے ہیں جن کو حسان کے نام سے یاد کیا ہے، صاحبِ مشکوۃ نے اکثر وبیشتر ہر باب میں تیسری فصل کا اضافہ کیا ہے، جس میں صحاحِ ستہ کے علاوہ دیگر کتبِ حدیث کی احادیث لائے ہیں؛ نیز احادیث کے علاوہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے اقوال وافعال بھی۔ جو باب کے مناسب تھے۔ جمع کر دیئے ہیں۔

مشکوۃ کی احادیث، کتب، ابواب

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ''بستان المحدثین''[۱۴۶] میں بیان کیا ہے کہ ''مصابیح'' کی احادیث [۴۴۸۴] ہیں، (ابن ملک نے بھی یہی تعداد بیان کی ہے) اس پر صاحب مشکوۃ نے [۱۵۱۱] کا اضافہ کیا ہے، تو ''مشکوۃ'' کی کل

[۱۴۶] [دیکھیے حاشیہ: ۱۴۵]

احادیث [۵۹۹۵] ہوئیں؛ لیکن صاحبِ مظاہرِ حق نے ''مصابیح'' کی احادیث [۴۴۳۴] مانی ہیں [۱۵۰]، اس اعتبار سے ''مشکوۃ'' کا مجموعہ [۵۹۴۵] ہے۔ ''تاریخ الحدیث'' میں ہے کہ ''مشکوۃ'' میں [۲۹] کتابیں، [۳۲۷] ابواب، اور [۱۰۳۸] فصلیں ہیں [۱۵۱]۔

صاحبِ مشکوۃ کا سن وفات معلوم نہ ہوسکا [۱۵۲]؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ ۷۳۷ھ کے بعد وفات ہوئی ہے، کیونکہ بروزِ جمعہ ماہِ رمضان ۷۳۷ھ میں تو اس کی تالیف سے فراغت ہوئی ہے، جیسا کہ صاحبِ مشکوۃ نے آخر کتاب میں تصریح کی ہے؛ بلکہ میں کہتا ہوں کہ ۷۴۰ھ کے بعد وفات ہوئی ہے، اس لیے کہ ''اکمال فی رجال المشکوۃ'' بھی خود انہیں کی تالیف ہے، اور اس سے ۲۷/ رجب ۷۴۰ھ میں فارغ ہوئے ہیں، چنانچہ صاحب تاریخ الحدیث نے ۷۴۰ھ مانا ہے، اور بعض حضرات نے اندازہ لگا کر ۷۴۸ھ بتلایا ہے۔

شروح وحواشی وتراجم

مشکوۃ کی بھی بہت سے لوگوں نے شرحیں لکھی ہیں:

[۱]: جن میں ملا علی قاریؒ کی ''مرقاۃ المفاتیح'' احناف کے لئے بڑی اچھی ہے، ہندوستان میں بھی اس کتاب کی مختلف شرحیں کی گئی ہیں۔

---

[۱۵۰] [مظاہر حق جدید: ۱/ ۴۲]

[۱۵۱] [کشف الظنون: ۲/ ۱۷۰۰۔ نفحات التنقیح: ۱/ ٦١]

[۱۵۲] زرکلی نے ۷۴۱ھ مطابق ۱۳۴۰ھ سن وفات لکھا ہے۔ [الاعلام للزرکلی: ٦/ ۲۳۴]

[۲] حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے شیخ سعیدؒ کا "مشکوۃ" پر ایک حاشیہ ہے۔

[۳] "اللمعات": حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے اس کی ایک شرح عربی میں مبسوط "لمعات التنقیح" نامی لکھی۔

[۴] "أشعة اللمعات": یہ فارسی میں مختصر شرح ہے۔

[۵] "ذریعة النجاة": شیخ عبد النبی عماد الدینؒ متوفی ۱۰۲۰ھ نے "ذریعة النجاة" نامی ایک شرح لکھی ہے۔

[۶] "زینة النکات": سید ابو المجد محبوب عالم بن سعید جعفری احمد آبادی متوفی ۱۱۱۱ھ نے "زینة النکات" نامی شرح لکھی ہے۔

[۷] "مظاہرِ حق": ایک اردو شرح نواب قطب الدین خان محدث دہلویؒ متوفی ۱۲۸۹ھ نے "مظاہرِ حق" نامی لکھی جو بہت مقبول ہے۔

[۸]: اس کا ایک اردو ترجمہ جلد اول مولانا کرامت علی جونپوری متوفی ۱۲۹۰ھ نے کیا ہے۔

[۹] "الرحمة المهداة": ایک اور اردو ترجمہ پوری کتاب کا نواب صدیق حسن خان کے صاحبزادہ نور الحسن نے "الرحمة المهداة" نامی کیا ہے۔

[۱۰] "التعلیق الصبیح": ماضی قریب میں اس کی ایک عربی شرح مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ متوفی ۱۳۹۴ھ نے "التعلیق الصبیح" نامی کی ہے۔

[۱۱] "مرعاة المفاتیح": ایک اور عربی شرح "مرعاة المفاتیح" نامی

مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری (اہل حدیث) نے لکھی ہے (۱۵۳)۔

(۱۵۳) [۱۲]: "تنظیم الأشتات لحل عویصات المشکوۃ" حضرت مولانا ابوالحسن صاحب شیخ التفسیر دارالعلوم ہاٹ ہزاری بنگلہ دیش کی چار جلدوں میں بہترین اردو شرح ہے۔
[۱۳]: میر سید شریف علی بن محمد جرجانی کا حاشیہ ہے، جو علامہ طیبیؒ کی شرح سے تو بہت مختصر لیکن نافع ہے۔
[۱۴]: "هداية الرواة الى تخريج المصابيح و المشكوة" للحافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ۔
[۱۵]: "نفحات التنقيح في شرح مشكوة المصابيح" حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کے درسی افادات کا مجموعہ حال ہی میں تین جلد میں شائع ہوا ہے، مفصل، مفید و قابل مطالعہ ہے۔
[۱۶]: "التقرير الرفيع لمشكوة المصابيح" از شیخ الحدیث، حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ، دو جلدیں، مطبوعہ: یادگار شیخ، سہارنپور۔
[۱۷]: "توضیحات" از مولانا فضل محمد صاحب، ۸/ جلدیں، مطبوعہ: مکتبۂ اسماعیل، دیوبند۔
[۱۸]: "التعليقات على تنظيم الاشتات" از مولانا غلام نبی قاسمی، ۲/ جلدیں، مطبوعہ: نعیمیہ، دیوبند۔
[۱۹]: "درسِ مشکوۃ" (باب الحوض والشفاعۃ تک) از مولانا محمد اسحاق صاحب، ۳/ جلدیں، مطبوعہ: دارالکتاب، دیوبند۔
[۲۰]: "اشرف المشکوۃ" از مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، ۵/ جلدیں، مطبوعہ: مکتبۂ تھانوی، دیوبند۔
[۲۱]: "مشکوۃ شریف مترجم" از مولانا ولی الدین محمد خطیب عمری، مطبوعہ: مکتبۂ الغزالی، کھتولی۔
[۲۲]: "مرآۃ درسِ مشکوۃ" از قاری طاہر صاحب، ۱/ جلد، مطبوعہ: دارالکتاب، دیوبند۔
[۲۳]: "اشرف التوضيح تقرير مشكوة المصابيح" از مولانا نذیر احمد صاحب، مطبوعہ: مکتبۂ عارفی، فیصل آباد۔
[۲۴]: "اسعد المفاتيح" از مولانا ابو محمد عبدالغنی جاجروی، مطبوعہ: مکتبۂ الحسن، لاہور۔
[۲۵]: "مشکوۃ المصابیح کی آسان شرح" افادات مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب، (كتاب الايمان الى الفرائض والوصايا) مطبوعہ: مکتبۃ الاسلام، کراچی۔
[۲۶]: "ایضاح المشکوۃ" از مولانا رفیق احمد المہروی ثم الفتیوی (بنگلادیش) ۲/ جلدیں، مطبوعہ: اتحاد بکڈپو، دیوبند۔
[۲۷]: "مصباح المشکوۃ" ایک ہزار احادیث کا انتخاب، از مفتی محمد فاروق صاحب میرٹھیؒ، ۱/ جلد، مطبوعہ: محمودیہ، میرٹھ۔
[۲۸]: "فیض مشکوۃ شرح مشکوۃ" از مفتی حارث عبدالرحیم فاروقی قاسمی، ۱/ جلد، مطبوعہ: فیض القرآن، دیوبند۔
[۲۹]: "مشكوة الأنوار شرح مشكوة" از مولانا اسلام الحق اسعدی، ۳/ جلدیں۔

نوع مشکوۃ

امر رابع نوع: یہ تو کتب حدیث کی انواع بیان ہوئیں، اس اعتبار سے ''مشکوۃ'' مستدرک، تخریج، اور تعلیق ہے۔

امر خامس مرتبہ: ''مشکوۃ'' کا مرتبہ فی زمانناتعلیم کے اعتبار سے کتبِ حدیث میں سب سے پہلے ہے اس لیے کہ یہ دورۂ حدیث سے پہلے پڑھائی جاتی ہے۔

امر سادس: قسمت وتبویب: کتاب کی تقسیم وتبویب وہ فہرست ہے جو کتابوں کے شروع میں یا آخر میں لگادیتے ہیں کہ فلاں مضمون فلاں صفحہ پر ہے اور یہ باب فلاں ورق پر ہے۔

امر سابع: حکم شرعی: اس حکم کی دو نوعیں ہیں، ایک پڑھنے پڑھانے کے اعتبار سے، دوسری اس کی احادیث پر عمل کرنے کے اعتبار سے، پڑھنے پڑھانے کی حیثیت سے تو اس کا حکم یہ ہے کہ بصورتِ تفرد واجب ہے اور بصورتِ تعدد واجب علی الکفایہ، یعنی اگر کتب احادیث میں صرف ''مشکوۃ شریف'' پائی جائے تو اس کا پڑھنا واجب العین ہے، اور اگر بہت سی کتب احادیث موجود ہوں تو اس کا پڑھنا واجب علی الکفایہ ہے؛ کیونکہ مقصود دین حاصل کرنا ہے۔ اور دوسری نوع (احادیث پر عمل) کے اعتبار سے حکم یہ ہے کہ

---

[۳۰]: ''الرفیق الفصیح لمشکوۃ المصابیح'' از علامہ رفیق احمد صاحب، ۱۶/جلدیں، مطبوعہ: محمودیہ، میرٹھ۔

[۳۱]: ''خیر المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح'' از علامہ شبیر الحق کشمیری، ۳/جلدیں، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان۔

اس کی احادیث پر عمل کرنا واجب ہے بشرطیکہ کوئی معارض موجود نہ ہو مثلاً کوئی آیت کریمہ معارض ہو یا اور کوئی حدیث، پھر جب تعارض ہوگا تو ہم غور کریں گے، یہ سات امور پورے ہوئے جن کا نام تھا ''مقدمۃ الکتاب''۔

منسوباتِ مشکوۃ

صاحبِ مشکوۃ نے کتاب المصابیح کی احادیث کو عموماً تیرہ ائمۂ حدیث کی طرف منسوب کیا ہے جن کے نام یہ ہیں: امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ترمذیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ، امام ابوداودؒ، امام نسائیؒ، امام ابن ماجہؒ امام دارمیؒ، امام دارقطنیؒ، امام بیہقیؒ، امام رزینؒ، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کا مختصر تذکرہ کردیا جائے۔

قال صلّى الله عليه وسلّم: (يحمل هذا العلمِ من كل خلف عُدُوله, يَنفون عنه تحريفَ الغالين وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين), رواه البيهقي في المدخل .

چھٹا باب

سترہ ائمۂ حدیث

(۱) تذکرۂ امام بخاری(۵۳)

امام بخاریؒ کی کنیت ابوعبداللہ ہے، اور نام ونسب یہ ہے:

محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرۃ بن بَرِدزبَہ۔ بردزبہ دہقان بخارا کی زبان میں کاشتکار یا کارندے کو کہتے ہیں، امام بخاری کو وِلا کی طرف منسوب کر کے جعفی کہتے ہیں، چونکہ اس زمانہ کا دستور تھا کہ جو شخص کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا تھا اس کو اسی کے قبیلہ کی طرف منسوب کرتے تھے؛ بخاری کے جدِ ثانی مغیرہ، حاکمِ بخارا یمان (بخاری) جعفی کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے، اس لیے بخاری کو جعفی بھی کہنے لگے۔

امام بخاری ۱۳/شوال ۱۹۴ھ کو جمعہ کے دن بعد نمازِ جمعہ پیدا ہوئے، آپ کمزور جسم کے تھے، نہ دراز قامت، نہ کوتاہ قد؛ بلکہ درمیانہ قدر کھتے تھے، بخاری بچپن میں ہی نابینا ہو گئے تھے، اس وجہ سے ان کی والدہ کو اس کا سخت قلق رہتا تھا، اور وہ نہایت گریہ وزاری سے خدائے پاک کی جناب میں ان کی بصارت کے لیے دعا کیا کرتی تھیں، ایک شب کو ان کی والدہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دیکھا، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے

---

(۵۳) امام بخاریؒ کے ترجمہ کے لئے دیکھیے: [تاریخ الخطیب: ۲/۴، ۳۶۔ انساب السمعانی: ۲/۱۰۰۔ وفیات الاعیان: ۴/۱۸۸۔ سیر اعلام النبلاء: ۱۲/۳۹۱۔ تذکرۃ الحفاظ: ۲/۵۵۵۔ تہذیب الکمال: ۲۴/۴۳۰۔ طبقات السبکی: ۲/۲۱۲۔ الکاشف: ۳۔ الترجمہ ۴۷۸۶۔ التقریب: ۲/۱۴۴۔ ثقات ابن حبان: ۹/۱۱۳۔ بحوالہ نفحات: ۱/۶۴]

تیری گریہ وزاری اور دعا کے سبب تیرے فرزند کو بصارت عنایت فرمائی، جب وہ صبح اٹھیں تو اپنے لخت جگر کی آنکھوں کو روشن پایا۔

امام بخاریؒ کو احادیث یاد کرنے کا بچپن ہی سے شوق تھا، چنانچہ دس سال کی عمر میں یہ حالت تھی کہ مکتب میں جس جگہ حدیث کا نام سنتے فوراً اس کو یاد کرلیتے، مکتب سے فراغت پائی اور یہ معلوم ہوا کہ بخارا میں داخلی علمائے حدیث میں سے ہیں تو ان کی خدمت میں آمد ورفت شروع کی، ایک روز کا واقعہ ہے کہ داخلی اپنے نسخہ سے لوگوں کو احادیث سنا رہے تھے اثنائے درس میں ان کی زبان سے نکلا سفیان عن ابی الزبیر عن ابراہیم امام بخاریؒ فوراً بول پڑے کہ حضرت ابوالزبیر کا لقا (ملاقات) تو ابراہیم سے ثابت نہیں؛ بلکہ یہ زبیر بن عدی ہیں؛ مگر داخلی نے ان کی بات کو تسلیم نہ کیا تو امام بخاریؒ نے کہا اس کو اصل نسخہ میں دیکھنا چاہئے، چنانچہ داخلی اپنے مکان میں تشریف لے گئے اور اصل نسخہ پر نظر ڈالی، باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ اس لڑکے کو بلاؤ، جب امام بخاریؒ حاضر ہوئے تو داخلی نے فرمایا کہ میں نے اس وقت جو پڑھا تھا بیشک وہ غلط نکلا، اب آپ بتلائیں کہ صحیح کس طرح ہے؟ اس پر امام بخاریؒ نے عرض کیا سفیان عن الزبیر بن عدی عن ابراہیم ہے، داخلی حیران ہو گئے اور کہا واقعی ایسا ہی ہے پھر قلم اٹھا کر قرأت کے نسخہ کی تصحیح کی۔

یہ واقعہ ان کی عمر کے گیارہویں سال کا ہے، جب امام بخاریؒ سولہ سال کے ہوئے تو آپ نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی تمام کتابیں یاد کرلیں، اور وکیعؒ کے نسخے بھی ازبر کرلیے، پھر اپنی والدہ اور بھائی احمد کے ہمراہ برائے حج مکۂ معظمہ تشریف لے گئے، حج سے فراغت پائی تو ان کی والدہ اور بھائی وطن

واپس چلے آئے اور وہ خود بلادِ حجاز میں طلبِ حدیث کے لیے رک گئے، جب اٹھارہ سال کے ہوئے تو سلسلۂ تصنیف شروع کیا اور فضائلِ صحابہؓ و تابعینؒ اور ان کے اقوال کا ذخیرہ فراہم کرنے لگے، یہاں تک کہ اس کو ایک مجموعہ کی شکل دے کر اور مرتب کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ مبارک پر ''کتاب التاریخ'' کا مسودہ شروع کر دیا، آپ راتوں کو چاند کی روشنی میں لکھا کرتے تھے۔

حاشد ابن اسماعیل (جو امام بخاریؒ کے زمانہ کے محدث ہیں) کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ طلبِ حدیث کے لیے میرے ہمراہ شیوخِ وقت کی خدمت میں آمد و رفت رکھتے تھے؛ لیکن ان کے پاس قلم و دوات یعنی لکھنے کا سامان کچھ نہ ہوتا تھا، اور نہ وہاں کچھ لکھتے تھے، میں نے ان سے کہا کہ جب تم حدیث کو سن کر لکھتے نہیں تو تمہارے آنے جانے سے کیا فائدہ؟ اس طرح سننا تو ہوا کی طرح ہے جو ایک کان سے گھس کر دوسرے کان سے نکل جاتی ہے، سولہ دن کے بعد امام بخاریؒ نے مجھ سے کہا کہ تم لوگوں نے مجھ کو تنگ کر دیا، آؤ! اب میری یاد کا اپنے نوشتوں سے مقابلہ کرو، اس مدت میں ہم نے پندرہ ہزار حدیثیں لکھی تھیں، امام بخاریؒ نے از بر صحت کے ساتھ سب کو اس طرح سنایا کہ میں خود اپنی لکھی ہوئی احادیث کو ان سے صحیح کرتا تھا، اس کے بعد امام بخاریؒ نے کہا کہ تم یہ خیال کرتے ہو کہ میں عبث اور بے فائدہ سرگردانی کرتا ہوں، حاشد بن اسماعیل کہتے ہیں کہ میں اسی روز سمجھ گیا تھا کہ یہ ہونہار ہیں، اور آگے چل کر کوئی ان سے مقابلہ نہ کر سکے گا۔

''جامع صحیح بخاری'' کی تصنیف کا سبب یہ ہوا کہ وہ ایک دن اسحٰق بن راہویہؒ کی مجلس میں حاضر تھے، اسحٰق بن راہویہؒ کے احباب نے کہا کہ کیا اچھا ہوا گر اللہ

تعالی کسی شخص کواس کی توفیق دے کہ سنن میں کوئی ایسا مختصر تیار کرے جس میں صرف صحیح حدیثیں ہوں جوصحت میں اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہوں؛ تاکہ عمل کرنے والے بلاخوف وتردد مجتہدین کی طرف مراجعت کیے بغیراس پر عمل پیرا ہوں، امام بخاریؒ کے دل میں یہ بات جاگزیں ہوگئی اوراسی وقت سے اس جامع کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ چھ لاکھ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جوان کے پاس موجود تھا انتخاب شروع کیا، جوان میں صحیح ترین تھیں ان پر اکتفاء کیا، اور بعض وہ احادیث جواسی درجہ پر صحیح تھیں ان کوطوالت کے خوف یا کسی دوسرے سبب چھوڑ بھی دیا۔

امام بخاریؒ جب کسی حدیث کے لکھنے کاارادہ کرتے تھے تو اول غسل کر کے دو رکعت نفل ادا فرماتے اوراس کو لکھتے، چنانچہ سولہ سال کے عرصہ میں اس انتخاب سے فراغت پائی، جب اس کا قصد کیا کہ ان حدیثوں کی ان کے مضمون کے مطابق ترتیب دی جائے (اس کو اصطلاح محدثین میں ترجمۃ الباب کہتے ہیں) تو مدینہ منورہ میں قبر مبارک اور منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیانی مقام میں اس اہم کام کوانجام دیا، ہر ترجمہ پر دو رکعت نفل ادا کرتے تھے۔

الغرض! امام بخاریؒ کی حسنِ نیت کا نتیجہ تھا کہ "جامع صحیح" اس قدر مقبول ہوئی کہ ان کی زندگی ہی میں اس کو نوّے ہزار آدمیوں نے آپ سے بلاواسطہ سنا، جن میں سب سے آخری فربریؒ ہیں، اور آج کل ان کی روایت ہی علوِ اسناد کی وجہ سے شائع ومشہور ہے۔

امام بخاریؒ کی نادر باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے: مجھ کو امید ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے کسی شخص کی غیبت کا سوال نہ کیا جائے گا؛

کیونکہ میں نے بفضل اللہ کسی کی غیبت نہیں کی، سبحان اللہ! کس قدر تعفف اور تورع تھا۔

طریقۂ صالحین کے مطابق امام بخاریؒ کو بھی محنت وابتلا یہ پیش آیا کہ خالد بن احمد ذہلی امیر بخارا نے ان کو اس امر کی تکلیف دینی چاہی کہ اس کے مکان پر آکر اس کے بیٹوں کو ''جامع'' و ''تاریخ'' اور دوسری کتابوں کا درس دیں، امام بخاریؒ نے جواب دیا: یہ حدیث کا علم ہے، میں اس کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا، اگر تم کو غرض ہے تو اپنے بیٹوں کو میری مجلس میں بھیج دیا کرو؛ تاکہ دوسرے طلبہ کی طرح وہ بھی علم حاصل کریں، امیر نے کہا: اگر ایسا ہے تو جس وقت میرے بیٹے آپ کے پاس آئیں آپ دوسرے طلبہ کو اپنی خدمت میں نہ آنے دیں، میرے دربان اور چوکیدار دروازہ پر تعینات رہیں گے، میری نخوت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ جس مجلس میں میرے بیٹے موجود ہوں وہاں جولاہے اور دھنیے بھی ان کے ہمنشیں ہوں، امام بخاریؒ نے اس کو بھی قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ یہ علم پیغمبر کی میراث ہے، اس میں ساری امت شریک ہے، کسی کی کوئی خصوصیت نہیں، اس گفت وشنید سے امیرِ مذکور، امام بخاریؒ سے رنجیدہ ہوگیا، طرفین میں کدورت بڑھتی رہی، نوبت بایں جارسید کہ امیرِ مذکور نے حریث بن ابی الورقاء اور اس وقت کے دوسرے علمائے ظاہری کو اپنے ساتھ ملالیا اور امام بخاریؒ کے مسلک پر طعن کرنے لگے اور ان کے اجتہاد میں غلطیاں نکال کر ایک محضر تیار کرایا اور اس حیلہ وبہانہ سے بخارا سے ان کو نکال دیا، امام بخاریؒ وہاں سے روانہ ہوئے تو انہوں نے جناب الٰہی میں دعا کی کہ اے اللہ ان لوگوں کو

اس بلا میں مبتلا کر جس میں وہ مجھ کو کرنا چاہتے ہیں، ابھی ایک مہینے بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ خالد بن احمد معزول ہوا، خلیفۂ وقت کا حکم پہنچا کہ اس کو گدھے پر سوار کر کے شہر میں گھمائیں، انجام کار اس کو کامل تباہی کا سامنا ہوا جیسا کہ کتبِ تاریخ میں لکھا ہوا ہے اور مشہور ہے، حریث بن ابی الورقاء کو بھی بے حد رسوائی اور فضیحت کا منہ دیکھنا پڑا، اس کا وقار خاک میں مل گیا؛ نیز اس وقت ان علما کو بھی- جو امام بخاریؒ کے درپۂ تذلیل اور (خالد بن احمد ذہلی کے) مشورہ میں شریک تھے- پوری پوری آفت پہنچی۔

امام بخاریؒ اس بے کسی کی حالت میں پہلے نیشاپور گئے، جب وہاں کے امیر سے بھی نہ بنی تو وہاں سے مراجعت کر کے ''خرتنگ'' تشریف لے آئے (یہ ایک گاؤں کا نام ہے جو ''سمرقند'' سے تین فرسخ [دس میل] کے فاصلہ پر واقع ہے) ۲۵۶ھ میں شبِ جمعہ کو لیلۃ الفطر تھی، عشا کی نماز کے وقت اسی جگہ امام بخاریؒ کا انتقال ہوا، عید کے دن نمازِ ظہر کے بعد دفن کر دیے گئے، امام بخاریؒ کی عمر ۶۲ سال کی ہوئی[۵۵]۔

عبدالواحد طوسیؒ نے- جو اس زمانہ کے صلحا و اکابر اولیا میں سے تھے- خواب میں دیکھا کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مع اپنے اصحاب کے سرِ راہ منتظر کھڑے ہیں انہوں نے سلام کر کے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کس کا

---

(۵۵) فیض الباری شرح بخاری کے مقدمہ ص: ۴۴ میں مختصر طور پر ولادت، وفات اور عمر کا یوں ذکر کیا ہے۔

کَانَ الْبُخَارِیْ حَافِظاً وَ مُحَدِّثاً — جَمَعَ الصَّحِیْحَ مُکَمَّلَ التَّحْرِیْرِ

مِیْلَادُہٗ صِدْقٌ وَ مُدَّۃُ عُمْرِہٖ — فِیْھَا حَمِیْدٌ وَ انْقَضٰی فِیْ نُوْرٍ

۱۹۴ ۶۲ ۲۵۶

انتظار ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا محمد بن اسماعیل بخاریؒ کا انتظار کر رہا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ اس خواب کے چند روز بعد ہی میں نے امام بخاریؒ کی وفات کی خبر سنی، جب میں نے لوگوں سے وقت وفات کی تحقیق کی تو وہی ساعت معلوم ہوئی جس میں میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں منتظر دیکھا تھا۔

وقتِ شدت، خوفِ دشمن، سختیٔ مرض، قحط سالی اور دیگر بلاؤں میں ''بخاری'' کا پڑھنا تریاق کا کام دیتا ہے، چنانچہ اکثر اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔

(۲) تذکرۂ امام مسلمؒ [۱۵۰]

امام مسلم ابن الحجاج القشیری نیشاپوریؒ کی کنیت ابوالحسین اور لقب عساکر الدین ہے، ان کے دادا کا نام مسلم بن ورد بن کرشاد ہے، بنی قشیر عرب کے مشہور قبیلہ بنی قشیر کی طرف منسوب تھے، نیشاپور خراسان کا ایک بہت خوبصورت اور بڑا شہر ہے اس لحاظ سے نیشاپوری بھی کہے جاتے تھے۔

امام مسلمؒ فنِ حدیث کے اکابرین میں شمار کیے جاتے ہیں، ابوزرعہ رازیؒ اور ابوحاتمؒ نے ان کی امامتِ حدیث کی گواہی دی ہے اور ان کو محدثین کا پیشوا تسلیم کیا ہے، ابوحاتم رازیؒ اور اس زمانہ کے دوسرے بزرگوں مثلاً: امام ترمذی اور ابوبکر بن خزیمہؒ نے ان سے روایت کی ہے۔

---

[۱۵۰] امام مسلمؒ کے ترجمہ کے لئے دیکھئے: [سیر اعلام النبلاء: ۱۲/ ۵۵۷۔ انساب السمعانی: ۱۰/ ۱۵۵۔ تذکرۃ الحفاظ: ۱۲/ ۵۵۷۔ انساب السمعانی: ۱۰/ ۱۵۵۔ تذکرۃ الحفاظ: ۱۲/ ۵۵۷۔ التقریب: ۲/ ۲۴۵۔ تاریخ الخطیب: ۱۳/ ۱۰۰۔ تہذیب الکمال: ۲۷/ ۴۹۹۔ الکامل فی التاریخ: ۷/ ۲۸۹و۸/ ۱۲۳]

امام مسلمؒ کی بہت سی تالیفات ہیں، جن میں تحقیق وامعان کامل طور سے کیا گیا ہے، اور ''صحیح مسلم'' میں تو خصوصیت کے ساتھ فنِ حدیث کے عجائبات بیان کیے گئے ہیں، اوران میں بھی اخص الخصوص سردِ اسانید اور متون کا حسنِ سیاق ہے، اور روایت میں تو آپ کا ورعِ تام اور احتیاط اس قدر ہے جس میں کلام کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اختصار کے ساتھ اسانید کی تلخیص اور ضبط انتشار میں یہ کتاب بے نظیر واقع ہوئی ہے، حافظ ابوعلی نیشاپوریؒ ان کی اس صحیح کو تمام تصانیفِ علمِ حدیث پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ ماتحت ادیم السّماء اصح من کتاب مسلم (فی علم الحدیث) یعنی علمِ حدیث میں روئے زمین پر ''مسلم'' سے بڑھ کر صحیح ترین اور کوئی کتاب نہیں ہے، اہل مغرب کی ایک جماعت کا بھی یہی خیال ہے، اس دعوی کی دلیل یہ ہے کہ امام مسلمؒ نے شرط لگائی ہے کہ وہ اپنی صحیح میں صرف وہ حدیث بیان کریں گے جس کو کم از کم دو تابعین نے دو صحابہ سے روایت کیا ہو، اور یہی شرط تمام طبقاتِ تابعین میں ملحوظ رکھی ہے؛ یہاں تک کہ سلسلۂ اسناد ان (امام مسلمؒ) تک ختم ہو، دوسرے یہ کہ وہ راویوں کے اوصاف میں بھی صرف عدالت ہی پر اکتفا نہیں کرتے؛ بلکہ شرائطِ شہادت کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں، امام بخاریؒ کے نزدیک اس قدر پابندی نہیں ہے، خلاصۂ کلام یہ کہ امام مسلمؒ نے نہایت تورع اور احتیاط کے ساتھ اپنی سنی ہوئی تین لاکھ حدیثوں میں سے اس صحیح کا انتخاب کیا ہے۔

امام مسلمؒ کے عجائبات میں سے یہ بھی ہے کہ آپ نے عمر بھر میں کسی کی غیبت نہیں کی، نہ کسی کو مارا اور نہ کسی کو گالی دی۔

صحیح وسقیم حدیثوں کی پہچان میں اپنے تمام اہلِ عصر میں ممتاز تھے؛ بلکہ

بعض امور میں ان کو امام بخاریؒ پر بھی ترجیح وفضیلت حاصل ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ امام بخاریؒ کی اکثر روایات اہلِ شام سے بطریقِ مناولہ (یعنی ان کی کتابوں سے لی گئی ہیں خود ان کے مؤلفین سے نہیں سنی گئیں) اس لیے ان کے راویوں میں کبھی کبھی امام بخاریؒ سے غلطی واقع ہو جاتی ہے، ایک ہی راوی کہیں اپنی کنیت اور کہیں اپنے نام سے مذکور ہوتا ہے، امام بخاریؒ اس کو دو سمجھ لیتے ہیں، یہ مغالطہ امام مسلمؒ کو پیش نہیں آتا؛ نیز حدیث میں امام بخاریؒ کے تصرفات مثلاً تقدیم وتاخیر، حذف واختصار کی وجہ سے بعض مرتبہ تعقید پیدا ہو جاتی ہے، ہر چند کہ خود بخاری ہی کے دوسرے طرق دیکھ کر وہ صاف بھی ہو جاتی ہے؛ لیکن امام مسلمؒ نے یہ طریقہ ہی اختیار نہیں کیا؛ بلکہ متون حدیث کو موتیوں کی لڑی کے مانند اس طرح مرتب کیا ہے کہ تعقید کے بجائے اس کے معانی اور چمکتے چلے جاتے ہیں۔

''صحیح مسلم'' کی طرح امام مسلمؒ کی دوسری مفید تالیفات بھی ہیں مثلاً: کتاب المسند الکبیر علی الرجال، کتاب الاسماء والکنی، کتاب العلل، کتاب الوحدان، کتاب حدیث عمرو بن شعیب، کتاب مشائخ مالک، کتاب ذکر اوہام المحدثین، کتاب التابعین۔

ابو حاتم رازیؒ نے- جو اکابر محدثین میں سے ہیں- امام مسلمؒ کو خواب میں دیکھا اور ان کا حال دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالی نے اپنی جنت کو میرے لیے مباح کر دیا ہے جہاں چاہتا ہوں رہتا ہوں۔

ابو علی زاغوانی کو ان کی وفات کے بعد کسی شخص نے خواب میں دیکھا اور ان

سے پوچھا کہ کس عمل سے تمہاری نجات ہوئی، تو انہوں نے ''صحیح مسلم'' کے چند اجزا کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ان اجزا کی بدولت۔

امام مسلمؒ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے، اور بعض نے کہا ۲۰۴ھ میں اور بعض ۲۰۶ھ بیان کرتے ہیں، ابن الاثیر نے ''جامع الاصول'' کے مقدمہ میں اسی کو اختیار کیا ہے، واللہ اعلم۔ ان کی وفات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کا انتقال یکشنبہ کی شام کو ہوا، اور ۲۴ / رجب ۲۶۱ھ میں دوشنبہ کے روز دفن کیے گئے۔

امام مسلمؒ کی وفات کا سبب بھی عجیب وغریب ہے، کہتے ہیں کہ ایک روز مجلسِ مذاکرۂ حدیث میں آپ سے کوئی حدیث پوچھی گئی آپ اس وقت اس کو نہ پہچان سکے، اپنے مکان پر تشریف لائے اور اپنی کتابوں میں اس کو تلاش کرنے لگے، کھجوروں کا ایک ٹوکرا ان کے قریب رکھا تھا آپ اسی حالت میں ایک ایک کھجور اس میں سے کھاتے رہے، امام مسلمؒ حدیث کی فکر وجستجو میں کچھ ایسے مستغرق رہے کہ حدیث کے ملنے تک تمام کھجوروں کو تناول فرما گئے اور کچھ خبر نہ ہوئی، بس یہی زیادہ کھجور کھالینا ان کی موت کا سبب بنا۔

حافظ عبدالرحمن بن علی الربیع یمنی شافعی کہتے ہیں:

تَنَازَعَ قَومٌ فِی الْبُخَارِیِّ وَمُسْلِم لَدَیَّ، وَقَالُوْا: اَیُّ ذَیْنِ یُقَدَّمُ؟

فَقُلْتُ: لَقَدْ فَاقَ الْبُخَارِیُّ صِحَّةً کَمَا فَاقَ فِی حُسْنِ الصَّنَاعَةِ مُسْلِمٌ.

میرے سامنے امام بخاریؒ وامام مسلمؒ کے بارے میں لوگوں نے تنازع کیا اور کہا کہ ان دونوں میں سے (مرتبہ) میں کون مقدم ہے؟ میں نے

کہا: امام بخاریؒ صحت کے اعتبار سے فوقیت رکھتے ہیں، جیسے امام مسلمؒ ترتیب ابواب میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں[۱۵۰]۔

(۳) تذکرۂ امام مالکؒ[۱۵۱]

امام مالکؒ کا مبارک نسب یہ ہے:

ابوعبداللہ مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن الحارث بن غیمان بن خثیل الأصبحي المدني۔

''اصبح'' یہ قبیلۂ قحطان کی ایک شاخ ہے جو یمن کا باعزت قبیلہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے جدِّ اعلیٰ حارث قبیلۂ اصبح سے تعلق رکھتے ہیں، اور اسی لیے ان کا لقب ''ذو اصبح'' ہے۔ آپ کے آباواجداد میں سب سے پہلے اسلام لانے والے آپ کے پردادا ابوعامر ہیں۔

ان کے صحابی ہونے میں علمائے اسماء الرجال کے درمیان اختلاف ہے۔ علامہ ذہبیؒ نے اپنی کتاب ''تجرید الصحابۃ'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی کو میں نے ان کا شمار صحابہ میں کرتے ہوئے نہیں پایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

۱۵۰ [فتح الملہم: ۱/ ۲۷۶۔ بستان المحدثین اردو ص ۱۸۰]

۱۵۱ امام مالکؒ کے ترجمہ کے لیے دیکھیے: [تہذیب الکمال: ۲۷/ ۹۱۔ طبقات ابن سعد: ۹/ ۲۵۰۔ حلیۃ الاولیاء: ۶/ ۳۱۶۔ انساب السمعانی: ۱/ ۲۸۷۔ الکامل فی التاریخ: ۵/ ۵۳۲۔ الفہرس لابن ندیم'' ص: ۲۸، ۲۸۴۔ تہذیب الاسماء للنووی: ۲/ ۷۵، ۷۹۔ سیر اعلام النبلاء: ۸/ ۴۸، ۱۲۱۔ تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۲۰۷۔ خلاصۃ الخزرجی: ۳۔ الترجمۃ: ۶۷۹۶۔ صفۃ الصفوۃ: ۲/ ۱۷۷، ۱۸۰۔ الکاشف ۳: الترجمۃ: ۵۳۲۹۔ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/ ۱۷۴، ۱۷۵۔ التقریب: ۲/ ۲۲۳۔ بحوالۂ نفحات التنقیح: ۱/ ۷۰]

کے زمانہ میں تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اپنی کتاب ''الإصابة'' میں ان کو قسمِ ثالث میں بیان کیا ہے، اور وہاں صرف ''ذہبی'' کا قول ذکر کیا۔ ''اصابہ'' میں قسمِ ثالث ان صحابہ کے تذکرہ میں ہے جنہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں کو پایا، اور کسی بھی روایت میں یہ نہیں آیا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی۔ اور قاضی ابو بکر بن العلی القشیری سے نقل کیا ہے کہ وہ جلیل القدر صحابی ہیں اور غزوۂ بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے ''تنویر الحوالک'' میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور آپ کے دادا مالک بن عامر کے تابعی ہونے میں کوئی کلام نہیں؛ بلکہ کبارِ تابعین میں سے ہیں اور صحاحِ ستہ کے راویوں میں سے ہیں۔ علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں کہ جن چار اشخاص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو غسل دیا اور رات کو لے جا کر قبر میں دفن کیا ان میں سے ایک ہیں۔ (مقدمۂ أوجز، الباب الثانی، الفصل الأول)

امام مالکؒ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے، چنانچہ یحییٰ بن بکیرؒ نے جو امام مالکؒ کے بڑے شاگردوں میں سے ہیں یہی بیان کیا ہے، امام مالک شکمِ مادر میں معمول سے زیادہ رہے، اس مدت کو بعض نے دو سال بیان کیا ہے اور بعض نے تین سال کہا ہے، آپ کی وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی۔

امام مالکؒ دراز قد، موٹا بدن، سفید رنگ، مائل بہ زردی، کشادہ چشم، خوبصورت، بلند ناک رکھتے تھے، ان کی پیشانی میں سر کے بال کمی کے ساتھ تھے، ایسے شخص کو عربی میں ''اصلع'' کہتے ہیں، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بھی

اصلع تھے، ڈاڑھی گنجان اور اس قدر لمبی تھی کہ سینہ تک پہنچی تھی، اور مونچھوں کے ان بالوں کو جو لبوں کے کنارہ پر ہوتے تھے کترواتے تھے، اور منڈوانے کو مکروہ سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ مونچھ کا منڈوانا مثلہ میں داخل ہے، اور مونچھ بھی آپ کی وافر تھی، اور اس میں جناب امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کی پیروی کرتے تھے، چنانچہ منقول ہے کہ أنـہ رضی اللہ عنه کان یفتل سبلته إذا أهمه أمر یعنی حضرت عمرؓ کو جب کوئی عظیم امر پیش آتا تو اپنی مونچھوں کو پیچ دیا کرتے تھے [۱۵۶]۔

واقدی نے بیان کیا ہے کہ امام مالکؒ کی ۹۰/ سال کی عمر ہوئی ہے؛ لیکن آپ نے ڈاڑھی کا کبھی خضاب نہیں کیا اور نہ حمام میں تشریف لے گئے، (قدیم زمانہ میں مستقل عمارت ہوتی تھی، جہاں گرم پانی سے غسل کا نظم ہوتا تھا اور خدام بدن کی مالش وغیرہ کے لیے مقرر ہوتے تھے) امام مالکؒ خوش پوشاک تھے، عدن کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے (عدن یمن کا ایک شہر ہے اور وہاں کے کپڑے نفیس اور بیش قیمت شمار ہوتے تھے) علاوہ ازیں خراسان اور مصر کے اعلیٰ قسم کے کپڑے بھی پہنتے تھے، آپ کا لباس اکثر سفید ہوتا تھا، اور اکثر عطر لگایا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ثروت یعنی مال و دولت عطا کیا ہو اور اس کا اثر اس پر ظاہر نہ ہو تو میں ایسے شخص کو اپنا دوست رکھنا پسند نہیں کرتا ہوں، کیونکہ اس نے حق تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو چھپا کر کفرانِ نعمت کیا ہے۔

اشہب- جو امام مالکؒ کے شاگرد ہیں- کہتے ہیں کہ جس وقت امام صاحبؒ

---

[۱۵۶] [بستان المحدثین اردو ص: ۱۴۳]

عمامہ باندھتے تھے تو اس کا ایک پلہ ٹھوڑی کے نیچے کر کے سر پر باندھتے تھے اور اس کی ایک جانب کو (جس کو اس ملک کے رواج کے مطابق ''شملہ'' اور اہلِ عرب ''عذبہ'' کہتے ہیں) دونوں شانوں کے درمیان ڈالتے تھے، عذر اور بیماری کے سوا سرمہ لگانے کو مکروہ خیال فرماتے تھے، آپ جب کبھی کسی ضرورت سے سرمہ لگاتے تھے تو باہر تشریف نہ لاتے تھے؛ بلکہ گھر ہی میں بیٹھے رہتے تھے۔ امام صاحبؒ کی انگشتری چاندی کی تھی، اس میں سیاہ رنگ کا نگینہ جڑا ہوا تھا، اور حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ اس پر کندہ تھا، مطرفؒ نے - جو امام مالکؒ کے شاگردوں میں سے ہیں - انگشتری پر اس آیت کو کندہ کرانے کا سبب دریافت کیا تو فرمایا میں نے سنا ہے کہ حق تعالیٰ کلام مجید میں مومنین کے حق میں فرماتا ہے: ''قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ(١٦٠)'' پس اس وجہ سے میرا دل یہ چاہتا ہے کہ آیت کا مضمون میرا نصب العین رہے، اور ہر وقت میرے پیش نظر رہ کر میرے دل پر یہ نقش ہو جائے۔

امام صاحبؒ کے مکان کے دروازے پر یہ کلمہ لکھا ہوا تھا ''ماشاء اللہ'' اس کا سبب بھی کسی سائل نے دریافت کیا تو فرمایا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰہُ(١٦١)'' اور میری جنت میرا مکان ہے پس میں یہ چاہتا ہوں کہ جب گھر میں آؤں تو یہ کلمہ مجھ کو یاد آ کر میری زبان پر جاری ہو جائے۔

---

(١٦٠) وہ بول اٹھے کہ: ''ہمارے لیے اللہ کافی ہے، اور وہ بہترین کارساز ہے''۔ [پ: ٤، سورۂ آل عمران، آیت نمبر: ١٧٣]

(١٦١) اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہو رہے تھے اس وقت تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ ماشاء اللہ۔ [پ: ١٥، سورۂ کہف، آیت نمبر: ٣٩]

مدینۂ منورہ میں جس مکان میں رہتے تھے وہ مکان حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مکان تھا، جو جلیل القدر صحابہ میں سے تھے، مسجد نبوی میں آپ کی نشست اس جگہ تھی جہاں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ بیٹھتے تھے۔

امام صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ میں نے تمام عمر کسی بیوقوف یا کوتاہ عقل والے کے ساتھ ہم نشینی نہیں کی، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ یہ ایک ایسی بڑی بات ہے جو سوائے امام مالکؒ کے کسی کو میسر نہیں ہوئی، علما کے زمرہ میں اس سے بہتر اور کوئی فضیلت نہیں ہوتی، اس لیے کہ بیوقوفوں کی صحبت نورِ علم کو تاریک کر دیتی ہے، اور تحقیق کی بلند چوٹی سے گرا کر تقلید کی پستی میں ڈال دیتی ہے، جس کی وجہ سے علم کی نفاست میں ایک گونہ خرابی اور نقصان آجاتا ہے۔

چونکہ امام صاحبؒ کھانا پینا خلوت میں رکھتے تھے، اس وجہ سے کسی نے آپ کو کھاتے پیتے نہیں دیکھا، امام صاحبؒ باوجود وقار اور خودداری کے اپنے اہل وعیال اور نوکر چاکر کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے، اور اس معاملہ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی پیروی فرماتے تھے۔

علم طلب کرنے کی تمنا اور خواہش بہت تھی، زمانۂ طالب علمی میں آپ کے پاس ظاہری سرمایہ کچھ زیادہ نہیں تھا، مکان کی چھت توڑ کر اس کی کڑیاں فروخت کر کے کتب وغیرہ کے صرف میں خرچ فرمایا کرتے تھے، اس کے بعد دولت کا دروازہ ان پر کھل گیا، اور کثرت سے بڑی بڑی فتوحات شروع ہو گئیں۔

آپ کا حافظہ بہت اعلی درجہ کا تھا، یہ فرمایا کرتے تھے جس چیز کو میں نے محفوظ کرلیا اس کو پھر کبھی نہیں بھولا، سترہ سال کی عمر میں آپ نے مجلسِ افادۂ تعلیم کی ابتدا فرمائی تھی۔

لوگ یہ قصہ نقل کرتے ہیں کہ اسی زمانہ میں مدینۂ منورہ میں ایک نیک عورت کی وفات ہوئی، جب غسل دینے والی عورت نے اس کو غسل دیا تو اس نیک بخت مردہ عورت کی شرمگاہ پر ہاتھ رکھ کر یہ کہا کہ یہ فرج کتنی زنا کار تھی، فوراً اس کا ہاتھ فرج پر ایسا چسپا ہوا کہ اس کے جدا کرنے کی سب نے کوشش وتدبیر کی؛ مگر فرج سے اس کا ہاتھ جدا نہ ہوا، انجام کار اس مشکل کو علما اور فقہا کے سامنے پیش کر کے اس کا علاج اور تدبیر دریافت کی، سب کے سب اس سے عاجز ہوئے؛ لیکن امام صاحبؒ نے اس راز کی حقیقت کو اپنے ذہنِ رسا اور کامل فہم سے دریافت کر کے یہ فرمایا کہ اس غسل دینے والی کو حدِ قذف (یعنی وہ سزا جو شریعت نے زنا کی تہمت لگانے والے کے لیے مقرر کی ہے) لگائی جائے، آپ کے اس ارشاد کے مطابق جب اس کے اسیّ درّے لگائے تو ہاتھ فرج سے فوراً جدا ہو گیا، سب کے دلوں میں امام صاحب کی ریاست وامامت اسی دن سے راسخ طور پر جاگزیں ہوگئی۔

امام صاحبؒ کی مجلس ایسی ہیبت اور وقار کی ہوتی تھی کہ اس میں شور وشغف ہونا تو درکنار کسی شخص کو بلند آواز سے گفتگو کرنے کی مجال اور طاقت نہ ہوتی تھی۔

استاد سے سند حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں: اوّل یہ کہ استاد پڑھے اور شاگرد سنتے رہیں۔ دوسرا یہ کہ شاگرد پڑھے اور استاد اس کو سنتے رہے، امام

مالکؒ کے یہاں یہی دوسرا طریقہ مروج تھا، اور اس کی خاص وجہ یہ تھی اہل عراق نے قرأت علی الشیخ کے طریق کو ترک کردیا تھا، اور حدیث حاصل کرنے کے طریق کو پہلی صورت میں منحصر خیال کرتے تھے، اور شیخ ہی سے سماع طلب کرتے تھے، امام صاحبؒ اور نیز دوسرے حجاز و مدینہ کے عالموں نے اس وہم کو دفع کرنے کی غرض سے اسی طریق کو اختیار فرمایا تھا، ورنہ قدیم محدثین کے یہاں بھی یہی طریق مروّج تھا کہ شیخ اپنے شاگردوں کو خود پڑھ کر سنایا کرتے تھے، اس طریق کو محدثین کی اصطلاح میں ''قرأۃ الشیخ علی التلمیذ'' کہتے ہیں۔

یحییٰ بن بکیرؒ نے- جو امام صاحبؒ کے منجملہ شاگردوں کے ایک شاگرد ہیں، اور اصحابِ مؤطا میں سے ایک ہیں- چودہ دفعہ کتاب مؤطا کو امام مالکؒ نے ان کی قرأت سے سنا ہے۔

ابن حبیبؒ- جو امام مالکؒ کے مخصوص احباب میں سے ہیں- بیان کرتے ہیں کہ امام صاحبؒ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہایت ادب فرماتے تھے، اور کمال ادب کی وجہ سے اس قدر احتیاط تھی کہ بوقت افادۂ حدیث اس مجلس میں کبھی زانو بھی نہیں بدلتے تھے؛ بلکہ جس ہیئت اور حالت کے ساتھ اول بیٹھتے تھے آخر تک وہی ایک حالت رہتی تھی۔

تمام عمر مدینہ کے حرم میں آپ نے قضائے حاجت نہیں کی؛ بلکہ ہمیشہ حرم سے باہر تشریف لے جاتے تھے، البتہ حالتِ مرض میں مجبوری کی وجہ سے معذور تھے۔

جب حدیث شریف سنانے کے لیے بیٹھتے تھے تو آپ کے لیے ایک چوکی بچھائی جاتی تھی، اور آپ عمدہ کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر حجرہ سے باہر نہایت عجز وانکساری کے ساتھ تشریف لاتے اور اس پر بیٹھ کر حدیث سنتے تھے، اور جب تک اس مجلس میں حدیث کا ذکر رہتا تھا مجمر یعنی انگیٹھی میں عود (لوبان) ڈالتے رہتے تھے۔

عبداللہ بن مبارکؒ- جو امام مالکؒ کے شاگرد ہیں، اور حدیث، فقہ، تفسیر اور قرأت کے بڑے امام ہیں، اور علما کے طبقہ میں ایسے مشہور ہیں کہ ان کی شہرت، تعریف وتوصیف سے بالکل مستغنی کرتی ہے- وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ روایت حدیث فرمارہے تھے، ایک بچھو نے نیش زنی کرنی شروع کی تو شاید دس مرتبہ آپ کو کاٹا، اس تکلیف کی وجہ سے امام صاحبؒ کا چہرہ کچھ متغیر ہو کر مائل بہ زردی ہوگیا؛ مگر امام صاحب نے حدیث کو قطع نہیں فرمایا اور نہ کچھ لغزش آپ کے کلام میں ظاہر ہوئی، جب مجلسِ حدیث ختم ہوئی اور سب آدمی چلے گئے تو میں نے آپ سے عرض کیا کہ آج آپ کے چہرہ پر کچھ تغیر محسوس ہوتا تھا، امام صاحبؒ نے فرمایا: بے شک تمہارا خیال صحیح ہے، اور پھر تمام واقعہ ان سے بیان کر کے فرمایا میرا اس قدر صبر کرنا اپنی طاقت کی بنا پر نہ تھا؛ بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی تعظیم کی وجہ سے تھا۔

سفیان ثوریؒ ایک روز امام مالکؒ کی مجلس میں آئے تو مجلس کی عظمت وجلال اور اس کی شان وشوکت کے ساتھ انوار کی کثرت اور برکتوں کو دیکھ کر امام صاحبؒ کی مدح میں یہ قطعہ نظم فرمایا ؎

يَأبَى الْجَوَابَ فَلَا يُرَاجِعُ هَيْبَةً وَالسَّائِلُوْنَ نَوَاكِسُ الْأَذْقَانِ

اَدَبُ الْوَقَارِ وَعِزُّ سُلْطَانِ التُّقَى فَهُوَ الْمُطَاعُ وَلَيْسَ ذَا سُلْطَانِ

(اگر امام مالکؒ) جواب دینا چھوڑ دیں تو سب سائل اپنا سر نیچا کیے بیٹھے رہیں اور آپ کی ہیبت سے دوبارہ نہ پوچھ سکیں۔

وقار آپ کا ادب کرتا تھا اور آپ پرہیزگاری کی بادشاہت پر عزت کے ساتھ متمکن تھے (عجیب بات یہ تھی کہ) آپ کی اطاعت کی جاتی تھی حالانکہ آپ بادشاہ نہ تھے۔

بشر حافیؒ - جو ایک مشہور صوفی اور باخدا آدمی تھے - فرماتے ہیں کہ دنیا کی نعمتوں اور زینتوں میں سے کسی شخص کا حدّثنا مالک کہنا بھی ایک بڑی نعمت ہے، یعنی امام مالکؒ کی شان و شوکت اس درجہ پہنچ گئی ہے کہ شاگرد اس کو دنیاوی مفاخر سے شمار کرتا ہے، حالانکہ وہ آخرت کا وسیلہ اور امورِ دین کا ذریعہ ہے۔

امام صاحبؒ اکثر اس شعر کو پڑھا کرتے تھے ؎

وَخَيْرُ أُمُوْرِ الدِّيْنِ مَا كَانَ سُنَّةً وَشَرُّ الْأُمُوْرِ الْمُحْدَثَاتُ الْبَدَائِعُ

ترجمہ: دین کا بہترین کام وہ ہے جو طریقہ رسول کے مطابق ہو اور بدترین کام وہ ہے جس میں سنت کے خلاف نئی نئی بدعتیں اپنی طرف سے تراش لی ہوں۔

یہ شعر حکمت سے پُر ہے، کیونکہ شاعر نے ایک حدیث نبوی کے مضمون کو نظم کیا ہے [١٦٣]، منجملہ اور کلاموں کے امام صاحبؒ کا ایک کلام یہ بھی ہدایت آمیز

[١٦٣] [مشکوۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ الفصل الأول ص: ٢٧]

ہے: ليس العلم بكثرة الرواية إنما هو نور يضعه الله في القلب یعنی کثرت سے روایت کرنے کا نام علم نہیں ہے وہ تو ایک نور ہے اللہ تعالی جس کے لیے چاہتا ہے اس کے قلب میں ڈال دیتا ہے، یہ کلمہ ایک گہری تحقیق رکھتا ہے جس کو اہل بصیرت خوب جانتے ہیں۔

ایک روز آپ سے کسی نے یہ دریافت کیا کہ: ماتقول في طلب العلم، تو آپ نے جواب میں فرمایا: حسن جميل، لكن أنظر مايلزمك من حين تصبح إلى أن تمسي فالزمه۔ طلب علم اچھی چیز ہے؛ مگر انسان کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ صبح سے شام تک جو امور اس پر واجب ہیں ان کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کرے، آپ کا یہ قول بھی گہری نظروں سے دیکھنے کے قابل ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ: لا ينبغي للعالم أن يتكلم بالعلم عند من لا يطيقه فإنه ذلّ وإهانة للعلم۔ یعنی عالم کو یہ لائق نہیں کہ وہ علمی مسائل کو ایسے شخص کے سامنے بیان کرے جو اس کا اہل نہیں ہے، کیونکہ اس میں علم کی اہانت اور ذلت ہے۔

امام صاحبؒ مدینۂ منورہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتے تھے، اور اس کا سبب یہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ: أنا أستحي من الله أن اطأ تربة فيها قبر رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحافر دابة، سواری کے سم سے ایسی سرزمین کے روندنے میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی قبر ہو مجھ کو اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے۔

امام صاحبؒ نے "موطأ" کو تالیف کرنا شروع فرمایا تو دوسرے لوگوں نے بھی اسی طرز پر لکھنا شروع کیا، اس پر بعض لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ

آپ اس قدر کیوں تکلیف گوارا فرماتے ہیں، دوسرے اشخاص بھی آپ کے شریک ہوکر اسی طرح کی ''موطا'' تصنیف کررہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ مجھ کو دکھلاؤ، چنانچہ آپ کے ارشاد کے موافق جب وہ تصانیف لائی گئیں تو آپ نے ان کو ملاحظہ فرما کر یہ فرمایا کہ عنقریب یہ معلوم ہوجائے گا کہ صرف خدا کے لیے کون سا امر واقع ہوا ہے، اور درحقیقت اب ان تصنیفات کا سوائے ''موطأ ابن ابی ذئب'' کے نام ونشان بھی معلوم نہیں ہوتا، ہاں ''موطأ امام مالک'' قیامت تک مخلوقات کی مخدوم اور علمائے اسلام کا سرمایہ رہے گی۔

حافظ ابونعیم اصفہانیؒ نے کتاب ''حلیۃ الاولیاء'' میں امام مالکؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے سندِ صحیح کے ساتھ یہ نقل کیا ہے کہ سہل بن مزاحمؒ نے۔ جو اپنے وقت کے عابدوں میں اور عبداللہ بن مبارکؒ۔ جو مرو کے رہنے والے ہیں۔ اور ان کے دوستوں میں سے تھے۔ یہ بیان کیا ہے کہ میں نے ایک روز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو میں نے آپ سے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت آپ کا خیر وبرکت والا زمانہ تو گذر گیا ہے، اگر ہمارے دل میں دینی کاموں میں کوئی شک وشبہ واقع ہو تو کس شخص سے تحقیق کریں؟ ہم کو ان کا پتہ ونشان بتلادیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ تم کو جو مشکل پیش آئے اس کو مالک بن انسؒ سے دریافت کرو۔

امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ امام مالکؒ کو جب حدیث کے کسی ٹکڑے میں شک پڑجاتا تھا تو پوری کی پوری حدیث ترک کردیتے تھے۔

وہب بن خالدؒ کہتے ہیں کہ مشرق ومغرب کے درمیان حدیثِ نبویہ کے

بارے میں امام مالکؒ سے بڑھ کر قابلِ اطمینان شخص کوئی نہیں۔

امام ترمذیؒ صحیح سند کے ساتھ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ دور دور کا سفر کریں گے؛ لیکن عالمِ مدینہ سے بڑھ کر عالم انہیں کہیں میسر نہیں آئے گا، سفیان بن عیینہؒ کے نزدیک اس مقولہ کا مصداق امام مالکؒ تھے۔

خلف بن عمرؒ کہتے ہیں: میں امام مالکؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ مدینہ کے قاری ابن کثیرؒ نے امام مالکؒ کو ایک پرچہ دیا، امام مالکؒ نے اسے پڑھا اور اپنی جانماز کے نیچے رکھ دیا، جب وہ کھڑے ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ چلنے لگا، فرمایا: بیٹھ جاؤ اور وہ پرچہ مجھے دیا، کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں یہ خواب لکھا ہوا تھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارد گرد جمع ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ مانگ رہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اس ممبر کے نیچے بہت بڑا خزانہ دفن کیا ہے اور مالک سے کہہ دیا ہے وہ تمہیں تقسیم کردیں گے، اس لیے مالک کے پاس جاؤ، لوگ یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے بتاؤ! مالک تقسیم کریں گے یا نہیں؟ کسی نے یہ جواب دیا جس بات کا امام مالکؒ کو حکم دیا گیا ہے وہ ضرور اسے پورا کریں گے، اس خواب سے امام مالکؒ پر گریہ طاری ہوگیا اور اتنا روئے کہ میں تو انہیں روتا ہی چھوڑ آیا۔

عبدالرحمن بن مہدیؒ کہتے ہیں کہ ہم امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر تھے ایک شخص آیا اور بولا میں چھ ماہ کی مسافت سے ایک مسئلہ پوچھنے کے لیے آیا ہوں، فرمایا کہو! کیا ہے؟ اس نے بیان کیا، آپ نے فرمایا: مجھے اچھی طرح

معلوم نہیں، وہ حیران ہو کر بولا تو اپنے شہر والوں سے کیا کہوں؟ فرمایا: کہہ دینا کہ مالک نے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے۔

آپ کی ہمشیرہ سے پوچھا گیا امام مالکؒ گھر میں کیا کرتے ہیں؟ فرمایا: تلاوت قرآن۔

محدثین کے نزدیک اصح الاسانید میں بحث ہے، مشہور یہ ہے کہ جس کے راوی مالک نافع سے، اور نافع ابن عمر سے ہوں وہ اسناد سب سے زیادہ صحیح ہیں، امام زہریؒ- جو آپ کے شیوخ میں شامل تھے وہ- بھی آپ سے مستفید تھے، لیث ابن مبارکؒ، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ جیسے مشاہیر آپ کے زمرۂ تلامذہ میں شامل تھے۔

امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے: اگر امام مالکؒ وحضرت سفیانؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا۔

ذہبیؒ کا بیان ہے کہ پانچ باتیں جیسی امام مالکؒ میں جمع ہو گئی ہیں میرے علم میں کسی اور شخص میں جمع نہیں ہوئیں۔[۱] اتنی دراز عمر اور ایسی عالی سند [۲] ایسی عمدہ فہم اور اتنا وسیع علم [۳] آپ کے حجت اور صحیح الروایۃ ہونے پر ائمہ کا اتفاق [۴] آپ کی عدالت، اتباع سنت اور دین داری پر محدثین کا اتفاق [۵] فقہ اور فتوی میں آپ کی مسلّم مہارت۔

عتیق زہریؒ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے شروع میں اپنی ''موطأ'' کو دس ہزار حدیث پر مشتمل فرمایا تھا، اس میں آہستہ آہستہ انتخاب فرماتے رہے، آخر اس حد تک پہنچا اور جب تک امام مالکؒ زندہ رہے ''موطأ'' میں کانٹ چھانٹ اور

اصلاح وترمیم کرتے رہے، اس وجہ سے اس میں نسخ بہت زیادہ ہوا ہے، اور ہر نسخہ کی ترتیب علیحدہ ہے، امام صاحبؒ کے شاگردوں نے اپنی اپنی استعداد کے لائق ترتیب دے کر رائج کیا ہے اور حدیثوں میں بھی فی الجملہ تھوڑا سا تفاوت ہے۔

ابوزرعہؒ نے۔ جو محدثین کے رأس رئیس ہیں۔ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح قسم کھا کر بیان کرے کہ ''اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو میری زوجہ پر طلاق جو کچھ ''مؤطا'' میں ہے وہ بلا شک وشبہ صحیح ہے'' تو وہ اپنی قسم میں حانث نہ ہوگا، یعنی اس کی عورت پر طلاق نہ پڑے گی، اس قدر وثوق واعتماد دوسری کتاب پر نہیں کیا جا سکتا ہے۔

حضرت امام مالکؒ سے ان کے زمانہ میں تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے ''مؤطا'' کو سن کر جمع کیا ہے، چنانچہ اس کے نسخے بہت ہیں اور لوگوں کے ہر طبقہ فقہا، محدثین اور صوفیا اور امرا اور خلفا نے تبرکاً اس عالی مقام امامؒ سے اس کی سند حاصل کی۔

ایک مرتبہ جعفر بن سلیمان سے کسی نے شکایت کر دی کہ امام صاحبؒ آپ کی امارت کے مخالف ہیں، اس نے آپ کو ستر کوڑے لگانے کا حکم دیا، اس کے بعد آپ کی عزت اور بڑھتی گئی، گویا یہ کوڑے آپ کا زیور بن گئے، منصور جب مدینہ آیا تو اس نے انتقام لینے کا ارادہ کیا، امام مالکؒ نے قسم کھا کر فرمایا میں تو اس کا ایک ایک کوڑا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت کی خاطر معاف کر چکا ہوں، مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ سزا آپ کو اس جرم میں دی گئی تھی کہ آپ نے کوئی فتوی ان کی غرض کے موافق نہیں دیا تھا۔

ائمۂ اربعہ میں صرف آپ ایک ہیں جن کی تصنیف فنِ حدیث کے متعلق امت کے ہاتھ میں موجود ہے، بقیہ جو تصانیف دوسرے ائمہ کی طرف منسوب ہیں وہ ان کے شاگردوں کی جمع کردہ ہیں؛ حتیٰ کہ "مسندِ احمد" بھی، گو اس کی تسوید خود امام موصوف نے کی ہے؛ مگر اس کی موجودہ ترتیب خود امامؒ کی نہیں ہے۔

قعنبی نقل کرتے ہیں کہ میں مرض الوفات میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، سلام کر کے بیٹھ گیا، دیکھا تو امام رو رہے تھے، میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کیسے نہ روؤں، مجھ سے زیادہ رونے کا اور کون مستحق ہوسکتا ہے، میری آرزو ہے کہ جو مسئلہ بھی میں نے اپنی رائے سے بتایا ہے ہر مسئلہ کے بدلہ مجھ کو ایک کوڑا مارا جائے، کاش میں نے اپنی رائے سے ایک مسئلہ بھی نہ بتایا ہوتا، مجھے گنجائش تھی کہ اس کے جو جوابات مجھ سے پہلے دیے جاچکے تھے ان ہی پر سکوت کر لیتا۔

ماہِ ربیع الاول ۱۷۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا، اور جس تمنا میں عمر گذری تھی آخر وہ آرزو پوری ہوئی، یعنی دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاکِ پاک نے ہمیشہ کے لیے آپ کو اپنی آغوش میں لے لیا، آپ سرزمینِ مدینہ ہی میں آسودۂ خواب ہیں۔

نسخِ موطّا

قاضی عیاضؒ کے قول کے مطابق "موطأ" کے مشہور نسخے بیس [۲۰] ہیں، بعض کا قول ہے کہ تیس [۳۰] ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے "بستان المحدثین" میں لکھا ہے کہ آج کل عرب میں "موطا" کے سولہ [۱۶] نسخے پائے

جاتے ہیں، اور ہر نسخہ ایک خاص راوی سے مروی ہے، ابوالقاسم بن محمد بن حسین شافعیؒ کا بیان ہے کہ امام مالکؒ سے گیارہ [۱۱] ''موطائیں'' مروی ہیں، اور سب کی سب قریب المعنی ہیں؛ البتہ ان میں چار مروّج تھیں، پہلا نسخہ یحییٰ بن یحییٰؒ کا، دوسرا ابن بکیرؒ کا، تیسرا ابومصعبؒ کا، اور چوتھا ابن وہبؒ کا، پھر بعد میں ابومصعبؒ اور ابن وہبؒ کے نسخوں کا رواج کم ہوگیا، ان نسخوں میں احادیث کی کمی زیادتی ہے، اور تقدیم وتاخیر بھی ہے، سب سے زیادہ احادیث نسخہ ابو مصعب میں ہیں، ابن حزمؒ کا قول ہے کہ اس ''موطأ'' میں دیگر موطاؤں سے سینکڑوں احادیث زائد ہیں (۱۳۳)۔

آج کل ملک عرب میں ان کثیر نسخوں میں سے چند نسخے پائے جاتے ہیں، پہلا نسخہ جس کا سب سے زیادہ رواج اور جو سب سے زیادہ مشہور ہے اور طائفۂ علماء کا مخدوم بھی یہی نسخہ ہے وہ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسیؒ کا نسخہ ہے، چنانچہ جب بھی مطلق یعنی بلا کسی قید کے ''موطأ'' کہا جاتا ہے تو فوراً اسی کی طرف ذہن جاتا ہے اور اسی پر منطبق وچسپاں ہوتا ہے۔

(۴) تذکرۂ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسیؒ

ابومحمد یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر بن وَسلاس بن شَملل بن مَنقایا، ان کی نسبت مصمودی ہے، اور صادی بھی کہتے ہیں، یعنی نسبت بسوئے صاد، مصمودہ بربر کا ایک قبیلہ ہے، ان کے اجداد میں سے منقایا پہلے شخص ہیں جو یزید بن عامر لیثی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، اور اسی وجہ سے ان کی نسبت ولائے اسلامی کے

(۱۳۳) [بستان المحدثین از ص ۱۱ تا ۲۲]

سبب لیثی ہے۔

منقایا کی اولاد میں پہلا شخص جس نے اندلس آکر سکونت اختیار کی تھی کثیر ہے، بعض کہتے ہیں یحییٰ بن وسلاس ہے، جو طارق کے لشکر میں آیا تھا، اور وسلاس بھی یزید بن عامر کے ہاتھ پر ایمان لایا تھا۔

یہ بھی جاننا چاہئے کہ یحییٰ بن یحییٰ نے امام مالکؒ سے "کتاب الاعتکاف" کے آخر کے چند ابواب کی سماعت نہیں فرمائی، اور وہ ابواب یہ ہیں، باب خروج المعتکف للعید، باب قضاء الاعتکاف، باب النکاح في الاعتکاف، چونکہ ان تینوں بابوں کی سماعت میں ان کو کچھ شبہ ہے، اس لیے ان کو زیاد بن عبدالرحمن سے روایت کرتے ہیں۔

یحییٰ بن یحییٰ نے امام مالکؒ سے استفادہ کرنے سے قبل اپنے شہر قرطبہ میں زیاد بن عبدالرحمنؒ سے پوری "موطأ" کی سند حاصل کی تھی، اس کے بعد ان کو طلب علم کا شوق دامن گیر ہوا، چنانچہ بیس برس کی عمر میں مشرق کی طرف سفر اختیار کیا، اور امام مالکؒ سے "موطأ" کو سنا، سنہ ۱۷۹ھ میں جو امام مالکؒ کی وفات کا سال ہے، ان کی ملاقات امامؒ سے ہوئی، امام کی وفات کے وقت یہ وہاں موجود تھے، امامؒ کی تجہیز و تکفین کی خدمت ان کو نصیب ہوئی، اندلس میں ہر شخص ان کو عزت کی نظروں سے دیکھتا تھا، کمال علمی کے مشار الیہ انہی کو خیال کیا جاتا تھا، استفتا کا انحصار ان پر سمجھا گیا تھا، ان سے پہلے اس دیار کے لوگ عیسیٰ بن دینارؒ سے فتویٰ دریافت کرتے تھے، یہ بھی امام مالکؒ کے بڑے شاگردوں میں تھے، انہی دو شخصوں کے سبب امام مالکؒ کا مذہب اندلس میں

پھیل گیا، یہ کہا جاتا ہے کہ یحییٰ کو عیسیٰ بن دینارؒ پر عقل ودانش میں برتری حاصل تھی، چنانچہ ابن لبابہ نے یہ شعر کہا ہے ؎

فَقِیْـهُ الْاُنْدُلُسِ عِیْسَی بْنُ دِیْنَارٍ　　وَعَالِـمُهَا ابْنُ حَبِیْبٍ وَعَاقِلُهَا یَحْیٰ

یعنی اندلس کے فقیہ عیسیٰ بن دینارؒ تھے　　اور عالم حبیب اور عاقل یحییٰ تھے

حضرت امام مالکؒ نے بھی ان کو عاقل کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا، چنانچہ منقول ہے کہ ایک دن یحییٰ بن یحییٰ امامؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر فیوضات کا استفادہ فرما رہے تھے، ان کے علاوہ اور اشخاص بھی امامؒ کی خدمت میں فیض یاب ہو رہے تھے کہ دفعتاً ہاتھی کے آنے کا شور وغل ہوا، چونکہ ملک عرب میں ہاتھی کو نہایت تعجب کے ساتھ دیکھا جاتا تھا، اور اسی وجہ سے بعض عرب کے رہنے والے ہاتھی کے دیکھنے کو فخریہ بیان کرکے مبارک بادی کے خواستگار ہوتے ہیں، جیسا کہ ابو الشقمق کے ان دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے

یَا قَـوْمِ اِنِّیْ رَأَیْتُ الْفِـیْلَ بَعْدَکُمْ　　فَـبَارَکَ اللّٰہُ لِیْ فِیْ رُؤْیَةِ الْفِـیْلِ

ای میری قوم! میں نے تمہارے بعد ہاتھی کو دیکھا ہے　　اللہ تعالیٰ اس ہاتھی کے دیکھنے میں میرے لیے برکت دے

رَأَیْتُـــهُ وَلَـهُ شَيْءٌ یُحَـرِّکُهُ　　فَکِـدْتُ اَصْنَعُ شَیْئًا فِي السَّرَاوِیْلِ

وہ اپنی کسی چیز (یعنی سونڈ) کو حرکت دے رہا تھا　　(جب میں نے اس کو دیکھا تو ڈر گیا) اور قریب تھا کہ میں اپنے پائجہ میں کچھ کردوں

اسی واسطے حاضرین کی جماعت کے اکثر افراد امام صاحبؒ کی صحبت ترک کرکے ہاتھی کا تماشہ دیکھنے کو دوڑ پڑے؛ مگر یحییٰ بن یحییٰ اسی ہیئت وحالت کے ساتھ بیٹھے ہوئے فیض حاصل کرنے میں مشغول رہے، اور نہ کسی قسم کا اضطراب

پیش آیا، نہ کوئی حرکت بے ساختہ ان سے ظاہر ہوئی، امامؒ اسی وقت سے عاقل کے خطاب سے ان کو مخاطب فرمایا کرتے تھے۔

ابن بشکوال نے بیان کیا ہے کہ یحییٰ بن یحییٰؒ مستجاب الدعوات تھے، اور وضع، لباس اور ہیئتِ ظاہری اور نشست و برخاست میں بھی حضرت امام مالکؒ کا اتباع فرماتے تھے، جو کچھ امام مالکؒ سے سنا تھا اس کے مطابق فتوی دیتے تھے، اور ہرگز امامؒ کے خلاف کو پسند نہیں فرماتے تھے، حالانکہ اس وقت لوگوں میں ایک مذہب کی تقلید راسخ نہیں ہوئی تھی نہ عوام میں نہ خواص میں، یحییٰ بن یحییٰ نے ہر مسئلہ میں امام مالکؒ کے مذہب و اتباع کو اختیار کیا ہے؛ مگر چار مسئلوں میں لیث بن سعد مصریؒ کے مذہب کو اختیار فرمایا ہے، اول یہ کہ صبح کی نماز اور نیز دیگر نمازوں میں قنوت پڑھنے کو جائز نہیں رکھتے تھے، دوسرے یہ کہ صرف ایک گواہ اور مدعی کی قسم پر فیصلہ کو روا نہیں رکھتے تھے، تیسرے یہ کہ نزاعِ زوجین کی صورت میں حَکَم مقرر کرنے کو واجب نہیں سمجھتے تھے، چوتھے یہ کہ کاشت کی زمین کا کرایہ اس کے محصول سے لینا جائز جانتے تھے، اندلس کے لوگ حضرت امام مالکؒ کے ساتھ کمالِ عقیدت رکھنے کی وجہ سے اس قلیل مخالفت میں بھی ان کی گرفت کرتے تھے، اور ان مسائل میں ان کے پیرو نہ تھے۔

یحییٰ کی وفات ماہ رجب المرجب سنہ ۲۳۴ھ میں ہوئی، ان کی عمر بیاسی برس کی تھی، قرطبہ میں ان کی قبر ہے، خشک سالی میں ان کے طفیل سے لوگ بارش اور برکت طلب کرتے تھے[۱۶۳]۔

---

[۱۶۳] [بستان المحدثین اردو، ص: ۲۴]

(۵) تذکرۂ زیاد بن عبد الرحمنؒ

آپ کی کنیت ابو عبد اللہ ہے، اور نسب یہ ہے:

زیاد بن عبد الرحمن بن زیاد لخمی، اور شبطون آپ کا لقب ہے جس کے ساتھ آپ مشہور ہیں، اور حاطب بن ابی بلتعہؓ - جو صحابی ہیں اور بدر کی لڑائی میں شریک ہوئے ہیں ان - کی اولاد میں سے ہیں، زیاد بن عبد الرحمن پہلے شخص ہیں جو امام مالکؒ کے مسلک کو اندلس میں لائے اور استفادہ کی غرض سے دو مرتبہ سفر کر کے امامؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

زہد و تقوی میں اپنے زمانہ کے ممتاز اور مستثنی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، جب امیر ہشام نے - جو قرطبہ کا رئیس تھا - زیاد بن عبد الرحمنؒ کو قرطبہ کے عہدۂ قضا سے سرفراز کرنا چاہا اور اس عہدہ کے قبول کرنے پر انہیں مجبور کیا تو وہ تنگ ہو کر قرطبہ چھوڑ کر چلے گئے، اس وقت ہشام یہ کہتا تھا کہ کاش تمام لوگ اگر زیاد جیسے ہوتے تو عالم کے دل میں دنیا کی رغبت نہ رہتی، اس کے بعد ہشام نے ان کو امن دے کر یہ تسلی نامہ لکھا کہ میں پھر آپ کو اس امر کی تکلیف نہ دوں گا، زیادؒ اس تسلی نامہ کو معلوم کر کے پھر اپنے مکان پر واپس آ گئے اور علم حدیث کے افادہ میں مشغول ہوئے۔

منقول ہے کہ اس ملک کے کسی بادشاہ نے زیادؒ کو خط لکھا، جب زیادؒ نے اس کا جواب لکھ کر سر بمہر کر کے روانہ کیا تو حاضرین خدمت نے عرض کیا کہ اس بادشاہ نے آپ کو کیا لکھا؟ اور آپ نے اس کا کیا جواب دیا؟ فرمایا کہ اس

بادشاہ نے خط میں یہ سوال کیا تھا کہ قیامت کے دن میزان عدل کے دونوں پلّے کس چیز کے ہوں گے چاندی کے یا سونے کے؟ میں نے جواب میں یہ حدیث لکھ دی: مالک عن ابن شهاب قال: قال رسول اللهﷺ: من حسن اسلام المرأ تركه مالا يعنيه۔

امام شافعیؒ کی وفات کا جو سال ہے وہی زیاد بن عبداللہ کی وفات کا ہے اور یہ ۲۰۴ھ ہے[۱۶۵]۔

موطأ کی وجہ تسمیہ

ابوحاتم رازیؒ سے پوچھا گیا کہ ''موطأمالک'' کا نام ''موطأ'' کیوں رکھا گیا؟ تو انہوں نے فرمایا (امام مالکؒ نے) ''شيء صنعه و وطاه للناس'' ایک چیز تیار کر کے لوگوں کے لیے ہموار کردی اس لیے اس کا نام ''موطأمالک'' ہوگیا۔

امام مالکؒ سے منقول ہے کہ میں نے اپنی یہ کتاب فقہائے مدینہ میں سے ستّر فقہا کے سامنے پیش کی، ان میں سے ہر ایک نے اس میں میری موافقت کی (فكلّهم واطاني عليه) اس لیے میں نے اس کا نام ''موطأ'' رکھا۔

ابن فہر کا قول ہے کہ یہ نام پہلے پہل امام مالکؒ ہی نے ایجاد فرمایا، اس لیے کہ آپ کے زمانہ میں جنہوں نے تصنیف فرمائی کسی نے ''الجامع'' نام رکھا، کسی نے ''المؤلف'' کسی نے ''المصنف''۔

وَطِأَ يَطأُ (روندنا) وَطَّأَ (تفعيل) تیار کرنا، آسان کرنا، ہموار کرنا، وَاطَأَ

[۱۶۵] [بستان المحدثین اردو، ص ۲۹]

يُواطِأُ (موافقت کرنا[139])۔

موطأ کے ایک مبہم راوی کی تعیین

قال ابن عبد البر: إذا قال مالک علیہ الرحمۃ عن الثقة عن بكير بن عبد الله الأشج، فالثقة مخرمة بن بكير، وقال النسائي: الذي يقول مالک في كتابه "الثقة عن بكير" يشبه أن يكون عمرو بن الحارث، وقال ابن عبد البر: إذا قال "عن الثقة عن عمرو بن شعيب" فهو عبد الله بن وهب، وقيل الزهرى، وقال ابن وهب: كل ما كان في كتاب مالک "أخبرني من لا أتِهم من أهل العلم" فهو الليث بن سعد، وقال ابن حجر: إذا قال "عن الثقة عن عمرو بن شعيب" فقيل: هو عمرو بن الحارث أو ابن لهيعة، و"عن الثقة عن بكير" قيل: هو مخرمة بن بكير، و"عن الثقة عن ابن عمر" هو نافع. (مقدمة أوجز، الفائدة الثالثة، مطبوعة مصري ص: ۳۵)

(٦) تذکرہ امام شافعیؒ[140]

آپ کی کنیت ابوعبداللہ، اسم مبارک محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن

---

[139] [مقدمۂ اوجز، ص ۲۱، الفائدة الثانية في وجه التسمية بالموطأ]

[140] امام شافعیؒ کے ترجمہ کے لیے دیکھیے: [سیر أعلام النبلاء: ۱۰ / ۵۔ تھذیب النووی: ۱ / ۴۵۔ ابن خلکان: ۴ / ۱۶۳، ۱۶۹۔ تذکرۃ الحفاظ: ۱ / ۳۶۱۔ حلیۃ الاولیاء: ۹ / ۶۳، ۱۶۱۔ الانساب السمعانی: ۷ / ۲۵۱۔ الکامل فی التاریخ: ۶ / ۳۵۹۔ تھذیب الکمال: ۲۴ / ۳۵۵۔ التقریب: ۲ / ۱۴۳۔ تاریخ الکبیر البخاری: ۱ / ۴۲۔ بحوالہ نفحات: ۱ / ۴۳]

شافع ہے، آپ نسباً قریشی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدِ اعلیٰ عبد مناف میں آپ کا نسب مل جاتا ہے۔

بیت المقدس کے دو مرحلہ کے فاصلہ پر غزہ یا عسقلان میں ۱۵۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، دو سال کی عمر میں آپ کے والدین آپ کو مکۂ مکرّمہ لے آئے تھے۔ نہایت تنگدستی میں آپ کی پرورش ہوئی، یہاں تک کہ علمی یاد داشتوں کے لکھنے کے لیے جب آپ کو کاغذ بھی میسر نہ آیا تو جانوروں کی ہڈیوں پر لکھ لیتے۔

آپ کی عمر کا ابتدائی حصہ شعر، تاریخ، ادب وغیرہ کی تحصیل میں گذرا، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں منیٰ میں تھا کہ پشت کی جانب سے مجھے ایک آواز آئی علیک بالفقہ (فقہ سیکھ)۔ اسبابِ ظاہر میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مسلم بن خالد زنجیؒ سے آپ کی ملاقات ہوئی، انہوں نے فرمایا کہ صاحبزادہ! کس ملک کے باشندہ ہو؟ میں نے کہا: مکہ مکرمہ کا، فرمایا: مکان کس محلہ میں ہے؟ میں نے کہا: خیف میں، پھر پوچھا کس قبیلہ کے ہو؟ میں نے کہا: عبد مناف کی اولاد، فرمایا: بہت خوب اللہ تعالیٰ نے تمہیں دونوں جہاں کا شرف بخشا ہے، اچھا یہ تھا کہ اپنی اس فہم وذکاوت کو علمِ فقہ میں خرچ کرتے، یہ سن کر آپ نے ان کی شاگردی قبول کی، ان کے بعد پھر امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت تک آپ ''موطأ'' حفظ کر چکے تھے، اور آپ کی عمر کل ۱۳ سال کی تھی ''موطأ'' میں شریک ہو گئے، جب قرآت کا وقت آیا تو آپ نے زبانی قراءت شروع کی، اس پر امام مالکؒ کو تعجب ہوا، اور آپ کی قراءت کو بہت پسند فرمایا، جب یہ ختم کرنے کا ارادہ کرنے

لگے تو فرمایا اور پڑھو، اور پڑھو، امام مالکؒ نے ان کے حق میں فرمایا تھا کہ تم تقوی اپنا شعار رکھنا، ایک زمانہ آئے گا کہ تم بڑے شخص ہوں گے، ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: اللہ تعالی نے تمہارے دل میں ایک نور ودیعت رکھا ہے، معصیت کر کے اسے ضائع نہ کرنا، اس کے بعد آپ عراق تشریف لے گئے، پندرہ سال کی عمر میں آپ کے شیخ مسلم بن خالدؒ نے آپ کو فتوی نویسی کی اجازت دے دی تھی، حدیث وتفسیر، فقہ وادب وعربیت کی جملہ خصوصیات کے ساتھ آپ بڑے ماہر تیر انداز بھی تھے، دس تیروں میں ایک تیر بھی خطا نہ کرتا تھا، نوویؒ "مقدمہ شرحِ مہذب" میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام عبدالرحمن بن مہدیؒ کے فرمانے پر امام شافعیؒ نے اصولِ فقہ میں "الرسالہ" تصنیف فرمایا تھا (اسی وجہ سے آپ کو اصولِ فقہ کا مؤسس کہتے ہیں)

فقہ میں آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ صحیح احادیث کو لیتے اور ضعیف کو ترک کر دیتے تھے، کسی اور مذہب میں فقہ کی تعمیر اس معیار پر نہیں کی گئی، عبادات کے مسائل میں آپ احتیاط کا پہلو اختیار فرماتے تھے، آپ کی تصنیف "کتاب الام" اور "الرسالہ" دونوں طبع ہو کر آج امت کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔

ان تمام فضائل کے باوجود نکتہ چینی سے آپ بھی خالی نہ رہے؛ حتی کہ یحییٰ بن معینؒ جیسے شخص سے آپ کے متعلق ایسے کلمات منقول ہیں جن کو دیکھ کر امام احمد بن حنبلؒ کو یہ کہنا پڑا: و من أين يعرف يحي الشافعي و من جهل شيئاً عاداه۔ (بھلا یحییٰ بن معینؒ امام شافعیؒ کو کیا جانے اور جو شخص کسی کو جانتا نہیں وہ اس سے خفا ہی رہتا ہے)

حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں: یحییٰ بن معینؒ سے متعدد طریقوں سے ثابت

ہے کہ وہ امام شافعیؒ کے بارے میں کلام کرتے تھے، یہاں تک کہ امام احمدؒ نے ان کو اس سے روکا، اور فرمایا کہ تمہاری ان دو آنکھوں نے بھی اس جیسا شخص نہ دیکھا ہوگا۔

تمام علم وفضل کے ساتھ انتہائی درجہ کے سخی تھے، حمیدیؒ ایک واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ آپ صنعاء سے تشریف لائے تھے اس وقت آپ کے پاس دس ہزار دینار تھے، آپ کا خیمہ مکۂ مکرمہ سے باہر لگا ہوا تھا، لوگ ملاقات کے لیے آتے تھے اور آپ ان کو دینار تقسیم کرتے؛ یہاں تک کہ بیٹھے بیٹھے آپ نے وہ تمام رقم لوگوں پر تقسیم کر ڈالی۔

وہ احادیثِ مرفوعہ جن کو خود امام شافعیؒ اپنے شاگردوں کے روبرو سند سے بیان فرمایا کرتے تھے، اور روایت کیا کرتے تھے، اور ان حدیثوں میں سے جو حدیثیں ابو العباس محمد بن یعقوب الاصمؒ نے ربیع بن سلیمان مرادیؒ سے سن کر ''کتاب الام'' اور ''مبسوط'' کے ضمن میں جمع کی تھیں، ان کو الگ جمع کر کے ''مسندِ شافعی'' نام رکھ دیا گیا۔

ابن خلکانؒ، ربیع بن سلیمان مرادیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے وفات کے بعد امام شافعیؒ کو خواب میں دیکھا، ان سے پوچھا: اللہ تعالی نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ امام شافعیؒ نے فرمایا: مجھے ایک سنہری کرسی پر بٹھا کر میرے اوپر تازہ بہ تازہ موتیوں کو بکھیر دیا گیا۔

سنہ ۱۹۵ھ میں بغداد گئے، دو سال وہاں قیام فرمایا، پھر مکۂ مکرمہ آئے، سنہ ۱۹۸ھ میں پھر بغداد شریف تشریف لے گئے، چند ماہ قیام فرما کر سنہ ۱۹۹ھ میں

مصر آئے، پھر وفات ۲۰۴ھ تک یہیں رہے،[۳۹] جمعہ کے دن انتقال ہوا، اور بعد عصر مدفون ہوئے، قبر مبارک قرافۂ صغریٰ میں مخلوق خدا کے لیے زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔

(۷) تذکرۂ امام احمد بن حنبل الشیبانی[۴۰]

ابن خلکان لکھتے ہیں کہ آپ کی پیدائش ۱۶۴ھ میں بغداد میں ہوئی، اور وہیں ۲۴۱ھ میں آپ کی وفات بھی ہوئی، آپ کا مزار مبارک بابِ حرب میں واقع ہے، یہ جگہ حرب بن عبداللہ کی طرف منسوب ہے۔

عباس بن محمد دوری کہتے ہیں کہ آپ عرب کے مشہور خاندان بنی ذہل بن

---

[۳۹] حضرت امام شافعیؒ کی پیدائش ۱۵۰ھ میں ملک شام میں ہوئی، ۱۸۴ھ میں بغاوت کے شبہ میں بغداد آمد ہوئی، یہ آمد ملزم کی حیثیت سے ہوئی تھی، اس وقت بغداد کے مشائخ وعلماء سے کسبِ فیض کیا، اس کے بعد مکۂ مکرمہ تشریف لائے، تقریباً مکہ میں نو سال درس دینے کے بعد دوبارہ بغداد ۱۹۵ھ میں تشریف لائے، بغداد میں دو سال قیام کرنے کے بعد مکۂ مکرمہ واپس آئے، ۱۹۸ھ میں تیسری بار بغداد تشریف لائے، چند ماہ قیام کرنے کے بعد مصر کا سفر اختیار کیا، ۱۹۹ھ میں مصر پہنچے، اس کے بعد وفات تک مصر ہی میں قیام فرمایا، امام شافعیؒ نے اپنے مستقل فقہی مذہب کی تشکیل اس وقت شروع کی جب ۱۹۵ھ میں دوبار بغداد تشریف لائے، بغداد میں ان کا مستقل فقہی دبستاں وجود میں آیا، ان کے بغدادی تلامذہ نے ان کے اجتہادات وآرا کی اشاعت کی۔ ۱۹۹ھ میں مصر تشریف لے جانے کے بعد انہوں نے اپنی فقہی آرا پر نظرِ ثانی کی، بہت سے مسائل میں ان کی تحقیق اور رائے تبدیل ہوگئی، فقۂ شافعی میں امام شافعیؒ کی دورِ بغداد کی آرا واجتہادات ''مذہبِ قدیم'' کے نام سے اور دورِ مصر کے اجتہادات ''مذہبِ جدید'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ (ماخوذ از بحث ونظر ۵۱۔ ۱۳ صفحہ ۸۷)

[۴۰] امام احمدؒ کے ترجمہ کے لیے دیکھیے: [تاریخ بغداد: ۴ / ۴۱۲۔ حلیۃ الالیاء: ۹ / ۱۶۱، ۲۳۳۔ تہذیب الاسماء واللغات: ۱ / ۱۱۰، ۱۱۲۔ وفیات الاعیان: ۱ / ۶۳، ۶۵۔ تہذیب الکمال: ۱ / ۴۳۷۔ تذکرۃ الحفاظ: ۲ / ۴۳۱۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۲ / ۲۷، ۳۷۔ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰ / ۳۲۵، ۳۴۳۔ سیر اعلام النبلاء: ۱ / ۱۷۷۔ بحوالۂ نفحات: ۷۵]

شیبان بن ثعلبہ سے متعلق تھے۔ خطیب بغدادی کہتے ہیں: یہ عباس دوری کی غلطی ہے، آپ کا خاندان بنی شیبان بن ذہل بن ثعلبہ تھا، یہ ذہل بن ثعلبہ رشتہ میں شیبان کا چچا ہے۔

آپ کے دو بیٹے تھے، صالح اور عبداللہ۔ اسی دوسرے بیٹے کے نام پر ابو عبداللہ آپ کی کنیت تھی، آپ نہایت خوبصورت تھے، قد میانہ تھا، ہلکا سرخ خضاب لگاتے تھے، ریش مبارک میں کچھ بال سیاہ تھے، سفید رنگ کے موٹے کپڑے پہنتے تھے، آپ کا عام لباس ازار اور عمامہ تھا۔

اپنے زمانہ کے متفق علیہ امام تھے، قتیبہ آپ کو اور اسحٰق بن راہویہؒ کو ''امام الدنیا'' کہا کرتا تھے۔ اسحٰق بن ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ امام احمد، اللہ تعالی اور اس کے بندوں کے درمیان اس کی حجت ہیں۔ علی بن مدینیؒ فرمایا کرتے تھے: اللہ تعالی نے اس دین کو دو شخصوں کے ذریعہ عزت نصیب فرمائی ہے، تیسرا مجھے کوئی اور شخص معلوم نہیں ہے، پہلے ظہورِ ارتداد کے وقت ابوبکر صدیقؓ تھے، اور دوسرے فتنۂ خلقِ قرآن کے زمانہ میں امام احمدؒ تھے۔ اسماعیل خلیل فرماتے تھے کہ اگر امام احمدؒ بنی اسرائیل میں پیدا ہوتے تو اللہ تعالی کے معجزوں میں ایک معجزہ شمار ہوتے۔

خطیب بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ طلبِ علم کے لیے امام احمدؒ نے کوفہ، بصرہ، حرمین شریفین، یمن، اور شام وغیرہ کا سفر کیا ہے، شیخ تاج الدین سبکیؒ نے امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ، وکیع ابن الجراحؒ، یحیٰی بن ابی زائدہؒ وغیرہم کو آپ کے اساتذہ میں، اور ائمۂ ستہ میں امام بخاریؒ و امام مسلمؒ و امام ابوداودؒ کو تلامذہ کی

فہرست میں شمار کیا ہے، ابن خلکان لکھتے ہیں کہ آپ امام شافعیؒ کے مخصوص شاگردوں میں تھے، جب تک امام شافعیؒ بغداد میں رہے آپ ان کی خدمت سے کبھی جدا نہیں ہوئے، جب امام شافعیؒ بغداد چھوڑ کر مصر جانے لگے تو چلتے وقت فرمایا: میں نے بغداد میں ان جیسا متقی اور فقیہ کوئی اور نہیں چھوڑا۔

ربیع بن سلیمانؒ کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ مصر تشریف لے گئے تو مجھ سے فرمایا: میرا ایک خط امام احمدؒ کو پہنچادو، اور اس کا جواب مجھے لادو، میں خط لے کر بغداد پہونچا، صبح کی نماز میں امام احمدؒ سے ملاقات ہوئی، جب محراب سے اٹھے تو میں نے خط پیش کیا اور عرض کیا کہ یہ امام شافعیؒ کا خط ہے، امام احمدؒ نے دریافت فرمایا: تم نے اس کو دیکھا؟ میں نے عرض کیا: نہیں، اس کے بعد آپ نے مہر توڑی اور پڑھا، تو آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، میں نے پوچھا اے ابو عبداللہ! خیر تو ہے؟ فرمایئے! کیا لکھا ہے؟ فرمایا: لکھا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا، فرماتے تھے کہ ابو عبداللہ کو میرا سلام کہہ دو اور کہہ دو! اس کا امتحان ہوگا، اور خلقِ قرآن کے قائل ہونے پر اسے مجبور کیا جائے گا، وہ اس کو منظور نہ کریں، اللہ تعالی اس کے صلہ میں تا قیامت ان کا نام اور علم روشن رکھے گا، ربیعؒ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اے ابو عبداللہ! بشارت مبارک ہو، فوراً امام احمدؒ نے اپنی قمیصوں میں سے نیچے والی قمیص جو جسم سے متصل تھی اتار کر مجھے انعام میں دے دی، میں اس کا جواب لے کر مصر آیا، اور امام شافعیؒ کی خدمت میں پیش کر دیا، امام شافعیؒ نے دریافت فرمایا: بولو! بشارت کے صلہ میں کیا انعام لائے ہو؟ میں نے کہا: امام احمدؒ کا اتارا ہوا کرتا ہے، فرمایا: یہ تکلیف تو میں تجھے نہیں دے سکتا کہ وہ قمیص ہی مجھے دے دے؛

البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اسے پانی میں بھگو کر نچوڑ، اور وہ پانی مجھے دے دے؛ تاکہ میں اسی کو تبرک رکھوں (طبقات)۔

اس واقعہ سے امام احمدؒ کی منقبت کے علاوہ یہ بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ پہلے محدثین وعلما کے درمیان کیسے تعلقات ہوئے ہیں، ان کا جو اختلاف تھا وہ صرف اللہ کے نام پر تھا، اس امتحان کی تفصیلی روئیداد شیخ تاج الدین سبکیؒ نے طبقات شافعیہ میں بیان کی ہے۔

قتیبہ بن سعیدؒ، امام احمدؒ اور وکیعؒ کے درمیان کے ایک مذاکرہ کا حال نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام احمدؒ دروازہ کی چوکھٹ پکڑ کر کھڑے ہوئے، اور سلمہ سے سفیان کی جو روایات ہیں ان کا تذکرہ ہونے لگا، دونوں آپس میں ایسے محو ہوئے کہ تمام رات یونہی کھڑے کھڑے کٹ گئی اور کسی کو خبر نہ ہوئی، جب صبح ہونے لگی تو آپ کی باندی حاضر ہوئی اور کہا کہ زہرہ ستارہ نکل چکا ہے۔

آپ کی مشہور تصنیفات میں ''مسند احمد'' سب سے زیادہ قابل ذکر ہے، حنبل بن اسحق آپ کے بھتیجے کہتے ہیں کہ امام احمدؒ نے ہم سے کہا کہ یہ کتاب میں نے سات لاکھ سے زیادہ احادیث کے ذخیرہ سے منتخب کی ہے؛ تاکہ مسلمانوں کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا ایک معیار بن جائے، جو حدیث اس میں مل جائے اسے حجت سمجھا جائے، اور جو نہ ملے اسے حجت سمجھا نہ جائے۔

ابوزرعہؒ فرماتے ہیں: امام احمدؒ کو دس لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد جب آپ کی کتابوں کا تخمینہ کیا گیا تو دس اونٹوں کے بوجھ سے

زیادہ تھا، اور وہ سب آپ کو زبانی حفظ تھیں۔

جمعہ کے دن آپ کا انتقال ہوا، آپ کے جنازہ میں نمازیوں کا اتنا ہجوم تھا کہ متوکل بادشاہ کے حکم سے جب نمازیوں کے قیام کی جگہ ناپی گئی تو پیمائش کے حساب سے دو لاکھ پچاس ہزار آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی۔

ورکانی امام احمدؒ کا پڑوسی بیان کرتا ہے کہ آپ کی وفات کے دن بیس ہزار یہود و نصاریٰ اور مجوس مسلمان ہوئے تھے؛ لیکن ذہبی نے اس حکایت کو تسلیم نہیں کیا اور منکر کہا ہے۔

احمد بن محمد کندی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ کو خواب میں دیکھا، پوچھا اے ابو عبداللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ فرمایا: بخش دیا، اور مجھے کہا اے احمد! ہمارے ہی لیے تم نے کوڑے کھائے تھے، میں نے عرض کیا: اے پروردگار! جی ہاں، ارشاد ہوا: تو اے احمد! میرا دیدار کر لے۔

اللہ تعالیٰ کے جن بندوں نے بھی اس کی راہ میں مصیبتیں جھیلی ہیں، ان کے نامۂ اعمال میں وہی ان کا سب سے زیادہ وزنی عمل ثابت ہوئی ہیں۔

(۸) تذکرۂ امام ترمذیؒ [ب]

آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

[ب] امام ترمذیؒ کے ترجمہ کے لیے دیکھیے: [تھذیب الکمال فی اسماء الرجال: ۲۶ / ۲۵۰۔ سیر اعلام النبلاء: ۱۳ / ۲۷۰۔ الکامل فی التاریخ: ۷ / ۴۶۰۔ وفیات الاعیان: ۴ / ۲۷۸۔ میزان الاعتدال: ۳۔ الترجمۃ ۸۰۳۵۔ التقریب: ۲ / ۱۹۸۔ الکاشف: ۳۔ الترجمۃ ۵۱۸۱۔ تھذیب التھذیب: ۹ / ۳۸۷۔ ثقات ابنِ حبان: ۹ / ۱۵۳۔ بحوالۂ نفحات التنقیح: ۱ / ۷۸]

ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسی بن ضحاک السلمی البوغی (بوغ ایک گاؤں کا نام ہے جو ترمذ کے دیہات میں سے ہے، اور اس سے چھ فرسخ کے فاصلہ پر واقع ہے) ترمذی، ترمذ اس پرانے شہر کا نام ہے جو آمو دریا (جس کو جیحون اور نہر بلخ بھی کہتے ہیں) کے کنارے پر واقع ہے، لفظ ماوراء النہر میں بھی بیشتر یہی نہر مراد لی گئی ہے، ترمذ تاء کے کسرہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ زیادہ مشہور ہے۔

امام ترمذیؒ، امام بخاریؒ کے سب سے مشہور شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں، خود امام بخاریؒ سے ان کے حق میں بہت سے کلماتِ تعریف منقول ہیں، محدثین ان کو امام بخاریؒ کا خلیفہ کہتے ہیں، ان کے افتخار کے لیے یہ کافی ہے کہ خود امام بخاریؒ نے بھی ان سے روایت لی ہے، امام مسلمؒ، امام ابوداودؒ اور ان کے شیوخ سے بھی روایت لیتے ہیں۔

کوفہ، بصرہ، رے، خراسان، اور حجاز میں طلبِ حدیث کے لیے سالہا سال سفر کرتے رہے، ان کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک شیخ کی روایت کے دو جزانہوں نے نقل کیے تھے؛ مگر اب تک ان کو پڑھ کر سنانے کا موقع نہ ملا تھا، مکہ مکرمہ کے راستے میں اتفاقاً ان سے ملاقات ہوگئی، ترمذیؒ نے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر ان سے ان اجزا کے قراءت کی درخواست پیش کی، شیخ نے قبول فرمایا اور کہا: ان اجزا کو نکال لو، میں پڑھتا ہوں، تم مقابلہ کرتے جاؤ، امام ترمذیؒ نے تلاش کیا تو اتفاقاً وہ اجزا ان کے ساتھ نہ تھے، امام ترمذیؒ بہت گھبرائے؛ لیکن اس وقت ان کی سمجھ میں سوائے اس کے اور کچھ نہ آیا سادے کاغذ ہاتھ میں لے کر فرضی طور پر سننے میں مشغول ہوجائیں، شیخ نے قراءت شروع کی اتفاقاً ان کی نظر

کاغذات پر پڑگئی تو سادے نظر آئے، شیخ کو طیش آیا اور فرمایا کیا میرا مذاق بناتے ہو، امام ترمذیؒ نے مجبوراً جو واقعہ تھا صاف عرض کر دیا اور کہا اگر چہ وہ جزا میرے ساتھ نہیں ہیں؛ لیکن مجھے لکھے ہوئے سے زیادہ محفوظ ہیں، شیخ نے فرمایا: اچھا! ذرا پڑھ کر سناؤ، امام ترمذیؒ نے وہ تمام حدیثیں پڑھ کر سنا دیں، شیخ بہت متعجب ہوئے، فرمایا: یقین نہیں آتا کہ صرف میرے ایک بار پڑھنے سے یہ سب حدیثیں تم کو محفوظ ہوگئی ہوں گی، امام ترمذیؒ نے عرض کیا اچھا امتحان کر لیجیے، شیخ نے خاص اپنی چالیس حدیثیں اور پڑھیں، امام ترمذیؒ نے فوراً ان کو بھی اس صحت کے ساتھ سنا دیا کہ کہیں ایک جگہ غلطی نہ ہوئی، اس واقعہ کے علاوہ ان کے حفظ کے اور بھی بہت سے واقعات مشہور ہیں۔

''جامع ترمذی'' ان کی بہت مشہور تصنیف ہے، مجموعی حدیثی فوائد کے لحاظ سے اس کتاب کو تمام کتابوں پر فوقیت دی گئی ہے، عراقیین اور حجازیین دونوں کے مسائل پر الگ الگ باب قائم کرتے ہیں، ہر باب کے تحت میں اگر چہ حدیث کا ذخیرہ تفصیلاً تو پیش نہیں کرتے؛ لیکن اس باب میں جتنے صحابہؓ کی حدیثیں ان کے زیر نظر ہوتی ہیں سب کی طرف صحابہؓ کے نام گنوا کر اشارات کر جاتے ہیں، رواۃ کی جرح وتعدیل، مشہور اسما کی کنیتیں، اور مشہور کنیتوں کے اسما، سلف کا تعامل اور ائمہ کے مسالک پر تقریباً ہر باب میں تنبیہ کرتے چلے جاتے ہیں، اس لحاظ سے اگر چہ یہ کتاب اپنے حجم کے اعتبار سے مختصر ہے؛ لیکن فوائد کے لحاظ سے بہت بڑی کتاب ہے، ''ترمذی'' سے پہلے بھی گو حدیث کی ثلاثی قسم کا پتہ چلتا ہے؛ مگر حسن وصحیح کو ہر جگہ اتنا روشن کرنے والے یہی پہلے شخص ہیں۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: اس کتاب میں دو حدیثوں کے علاوہ کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جس پر امت میں کسی نہ کسی کا عمل نہ ہو۔

حفظ واتقان، علم وفہم کے ساتھ بہت خدا ترس بھی تھے، اللہ تعالی کا خوف وخشیت ان پر اتنا غالب تھا کہ روتے روتے آخر کار ان کی بینائی جاتی رہی۔

ان کی کنیت ابوعیسیٰ تھی ''ابوداود'' میں اس کنیت کی ممانعت منقول ہے، شارحینِ حدیث نے اس کی مختلف توجیہات نقل کی ہیں:

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ''بستان المحدثین'' میں عام شارحین کے علاوہ ایک جدید توجیہ کی ہے[۱۰۱]۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی کنیت ابوعیسیٰ تھی، تو ان سے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کیا تم کو ابوعبداللہ کی کنیت کافی نظر نہیں آتی؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کنیت سے پکارا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تو تمام اگلی پچھلی لغزشیں اور بھول چوک اللہ تعالی نے معاف فرمادی تھیں، اور ہم تو ایک امرِ مضطرب میں مبتلا ہیں، پھر انہوں نے مرتے دم تک اپنی کنیت ابوعبداللہ ہی رکھی۔ ''ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کنانی'' کے معنی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ابوعیسیٰ کہہ کر بلایا اور پکارا ہے، نہ یہ کہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ تیری کنیت ابوعیسیٰ ہے، حضرت عمرؓ کے کلام کے یہ معنی ہے کہ ابوعیسیٰ کی کنیت مکروہ ہے، یہ کنیت نہ رکھنی چاہیے، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ اس کنیت کے ساتھ پکارلیا تو تمہارے لیے یہ مناسب نہیں

---

(۱۰۱) [بستان المحدثین اردو، ص ۱۸۷]

کہ اسے اپنی کنیت قرار دے دو، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کبھی صرف بیانِ جواز کے لیے ایک امرِ اولیٰ ترک فرمادیا کرتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ترکِ اولی کراہیت سے پاک تھا، آپ کو یہ ضرورت بھی محض تبلیغِ حکم کی وجہ سے پیش آئی اور ماتقدم من ذنبہ الخ کے معنی بھی یہی ہے۔

(۹) تذکرۂ امام ابوداودؒ (۱۰)

آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

ابوداود سلیمان بن الاشعث بن اسحٰق بن بشیر بن شداد بن عمرو بن عمران الازدی السجستانی۔

آپ کی ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی، سجستان کی تحقیق میں مؤرخ ابن خلکان نے ایک مشہور غلطی کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ بصرہ میں ایک قریہ کا نام ہے، شیخ تاج الدین سبکیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ان کا وہم ہے، صحیح یہ ہے کہ سیستان قندھار وچشت کے قریب ایک مقام ہے، یہ نسبت اسی کی طرف ہے۔

انہوں نے مصروشام، حجاز وعراق اور خراسان وغیرہ بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے۔ حفظ واتقان، روایت وعبادت، تقوی وصلاح میں یگانۂ روزگار تھے، حاکمؒ کہا کرتے تھے کہ امام ابوداود کسی پس وپیش کے بغیر اپنے زمانہ کے امام تھے۔

---

(۱۰) امام ابوداودؒ کے ترجمہ کے لیے دیکھیے: [تاریخ بغداد: ۹/ ۵۵۔ تھذیب الکمال: ۱۱/ ۳۵۵۔ ثقات ابن حبان: ۱/ ۱۷۲۔ انساب السمعانی: ۷/ ۴۶۔ الکامل فی التاریخ: ۷/ ۴۲۵۔ وفیات الاعیان: ۲/ ۴۰۴۔ سیر اعلام النبلاء: ۱۳/ ۲۰۳۔ تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۵۹۱۔ طبقات السبکی: ۲/ ۴۸۔ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/ ۵۴۔ بحوالۂ لمحات التنقیح: ۱/ ۸۱۔ بستان المحدثین اردو، ص ۱۸۰]

موسیٰ بن ابراہیم۔ جو ان کے معاصر تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوداودؒ دنیا میں حدیث کے لیے اور آخرت میں جنت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ابراہیم بن حربی کا مقولہ ہے کہ علم حدیث ان کے لیے اس طرح نرم کر دیا گیا تھا جیسا کہ حضرت داود علیہ السلام کے لیے لوہا۔ امام ترمذی و امام نسائیؒ جیسے ائمۂ حدیث کا ان کے تلامذہ میں شمار ہے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ خود امام احمد تو ان کے اساتذہ میں ہیں؛ لیکن امام احمدؒ کے بعض اساتذہ نے ان سے روایت لی ہے؛ بلکہ امام احمدؒ نے بھی عیشرہ کی حدیث ان سے لی ہے۔

''سنن ابوداود'' ان کی مشہور تصنیف ہے، اس میں ۴۸۰۰/ حدیثیں حسن وصحیح جمع کی ہیں، اور اپنے نزدیک کوئی ایسی حدیث درج نہیں کی جو قابلِ حجت نہ ہو، امام ابوداودؒ نے جب اس کتاب کو امام احمدؒ کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے بہت پسند فرمایا۔

امام ابوداودؒ نے پانچ لاکھ حدیثوں کے مجموعہ میں سے انتخاب کر کے اس کتاب کو مرتب فرمایا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ ان احادیث میں سے عقلمند کے لیے دین میں صرف چار حدیثیں کفایت کرتی ہیں:

اول: ''إنما الأعمال بالنیات''(۱)۔

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

دوم: ''من حسن إسلام المرأ ترکه مالا یعنیه''(۲)۔

اسلام کی عمدگی سے یہ بات ہے کہ انسان بے فائدہ امور کو ترک کر دے۔

---

(۱) [ابوداود، باب فی ما عنی به الطلاق والنیات، کتاب الطلاق، رقم الحدیث ۲۲۰۱]

(۲) امام ابوداود کی سند سے حافظ ابوبکر احمد بن علی خطیب بغدادی نے یہ چاروں حدیث ان ہی الفاظ سے نقل فرمائی ہیں، ملاحظہ کیجیے: تاریخ بغداد، المجلد التاسع، رقم الترجمۃ: ۴۶۳۳، عدد احادیث سنن داود، ص: ۵۷۔

سوم: "لا یؤمن أحد کم حتیٰ یحب لأخیه مایحبّ لنفسه"(۱)۔

اس وقت تک مؤمن کامل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جس کو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

چہارم: "الحلال بیّن والحرام بیّن وبینهما مشتبهات فمن اتقی الشبهات إستبرألدینه"(۲)۔

حلال وحرام دونوں ظاہر ہیں اور ان کے درمیان مشتبہات ہیں پس جس شخص نے شبہات سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین کو محفوظ کرلیا۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان کے کافی ہونے کے یہ معنی ہے کہ شریعت کے قواعدِ کلیہ مشہورہ معلوم کرنے کے بعد جزئیاتِ مسائل میں کسی مجتہد یا مرشد کی ضرورت باقی نہیں رہتی، مثلاً عبادت کی درستی کے لیے پہلی حدیث، اور عمرِ عزیز کے اوقات کی حفاظت کے لیے دوسری حدیث، اور حقوقِ ہمایہ و خویش واقارب اور دوسرے اہلِ تعارف ومعاملہ کی رعایت کے لیے تیسری حدیث، اور ان شکوک وتردّدات کے ازالہ کے لیے جو اختلافِ علما یا دلائل کے مختلف ہونے سے پیدا ہوتے ہیں چوتھی حدیث کافی ہے، گویا مردِ عاقل کے لیے یہ چاروں حدیثیں استاد وپیر کے درجہ میں ہیں۔

امام ابوداودؒ کے فقہی مسلک میں اختلاف ہے، ابن خلکان نے لکھا ہے کہ شیخ ابواسحٰق شیرازیؒ نے "طبقات الفقہاء" میں انہیں حنبلیوں میں شمار کیا ہے، حافظ ذہبیؒ کے بیان سے بھی یہی قیاس ہوتا ہے۔

(۱) یہ الفاظ بخاری شریف کی حدیث کے ہیں، ملاحظہ کریں: بخاری، کتاب الایمان، ص:٦۔

(۲) [ابوداود، باب فی اجتناب الشبهات، کتاب البیوع، رقم الحدیث ۳۳۲۹]

لباس میں آپ کی ایک خاص عادت تھی، وہ یہ کہ اپنے قمیص کی ایک آستین فراخ اور دوسری تنگ رکھا کرتے تھے، جب آپ سے سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا: ایک آستین تو اس لیے کشادہ رکھتا ہوں کہ اس میں اپنی کتاب کے کچھ اجزا رکھ لوں، دوسری آستین کشادہ رکھنا اسراف میں داخل سمجھتا ہوں، ۱۶/ شوال ۲۷۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا اور بصرہ میں دفن ہوئے، تہتر (۷۳) سال کی عمر پائی۔

آپ کا عجیب واقعہ

امام صاحبؒ ایک مرتبہ بڑی کشتی پر سوار کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے، اچانک ساحل پر کھڑے کسی شخص کو چھینک آئی، اس نے الحمدللہ کہا، امام ابوداودؒ نے کشتی میں سواری کی حالت میں تحمید سنی، آپ نے کشتی بان سے کہہ کر ایک چھوٹی کشتی جو بڑی کشتی کے ساتھ تھی ایک درہم میں کرایہ پر لی اور کنارے پر تشریف لے گئے، اور اس کی تحمید کا جواب دیا، جب بڑی کشتی میں داخل ہوئے تو لوگوں نے اس عمل کی وجہ معلوم کی تو فرمایا: میں اس خیال سے گیا تھا ممکن ہے کہ وہ مستجاب الدعوات ہو اور جب میں اس کو ''یرحمک اللہ'' کہوں تو وہ جواب میں ہدایت کی دعا دے اور وہ دعا قبول ہو جاوے، اسی آرزو میں یہ زحمت اٹھائی، جب سفر آگے کو ہوا اور تمام کشتی والے سو گئے تو ایک غیبی آواز سنائی دی: ''یا أهل السفينة أن أبا داؤد اشترى الجنة بدرهم'' اے کشتی والوں! ابوداودؒ نے ایک درہم میں جنت خرید لی۔

(۱۰) تذکرۂ امام نسائیؒ ۞

آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:
ابو عبدالرحمن احمد بن شعیب بن علی بن بحر بن سنان بن دینار نسائی۔

نسا: خراسان میں ایک مشہور شہر ہے، اس کی طرف نسبت میں نسوی بھی کہا جاتا ہے (اور قیاس کے مطابق بھی یہی ہے؛ مگر مشہور نسائی ہے) بہت بڑے حافظ حدیث ہیں، آپ کی ولادت سنہ ۲۱۴ھ میں ہوئی (بعض ۲۱۵ھ بھی بتلاتے ہیں) ذہبی فرماتے ہیں: میں نے اپنے شیخ سے پوچھا: امام مسلمؒ زیادہ حفظ رکھتے ہیں یا امام نسائیؒ؟ فرمایا: امام نسائیؒ، پھر میں نے اپنے والد سے یہی سوال کیا، انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔

ابن طاہر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سعد بن علی زنجانی سے میں نے ایک شخص کا حال دریافت کیا، انہوں نے اس کو ثقہ فرمایا، میں نے کہا کہ امام نسائیؒ تو اس کو ضعیف کہتے تھے، فرمایا: راویوں کے متعلق امام نسائیؒ کی شرائط امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ سے بھی زیادہ سخت تھیں، ابن الحداد شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں اپنے اور اللہ کے مابین امام نسائیؒ کو واسطہ بنا چکا ہوں۔

طلبِ حدیث کے لیے انہوں نے حجاز، عراق، شام اور مصر وغیرہ کا سفر کیا تھا۔ بڑے بڑے شیوخ سے ملاقات کی تھی۔ سب سے پہلے یہ قتیبہ بن سعدؒ کے

۞ امام نسائیؒ کے ترجمہ کے لیے دیکھیے: [تھذیب الکمال: ۱/ ۳۲۸۔ الکامل فی التاریخ: ۱/ ۹۶۔ وفیات الاعیان: ۱/ ۷۷، ۷۸۔ تھذیب التھذیب: ۱/ ۱۲۔ تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۶۹۸۔ طبقات الشافعیۃ الکبری: ۲/ ۸۳۔ البدایۃ والنھایۃ: ۱۱/ ۱۲۳، ۱۲۴۔ بحوالہ منتخبات التنقیح: ۱/ ۸۳۔ بستان المحدثین" اردو، ص۱۸۸]

پاس گئے ہیں، اس وقت ان کی عمر پندرہ سال کی تھی، اور ایک سال دو ماہ ان کی خدمت قیام کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ فروع میں یہ امام شافعیؒ کے مسلک پر تھے، ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ بایں ہمہ کثیر الجماع تھے، چنانچہ چار عورتیں آپ کے نکاح میں تھیں، اور ہر کے پاس ایک ایک شب رہتے تھے، ان کے علاوہ باندیاں بھی موجود تھیں۔ پہلے انہوں نے ''سننِ کبریٰ'' تصنیف فرمائی تھی، امیر وقت نے ان سے پوچھا کہ اس کتاب میں جتنی حدیثیں آپ نے جمع کی ہیں کیا وہ سب صحیح ہیں؟ فرمایا: نہیں، حسن بھی ہیں، اس نے کہا: میرے لیے ایک مجموعہ مرتب فرما دیجیے، جس میں صرف صحیح حدیثیں ہوں، اس کے بعد آپ نے ''سننِ صغریٰ'' تالیف فرمائی جس کو ''مجتبیٰ'' بھی کہا جاتا ہے۔

ان کی وفات کا واقعہ یہ ہے کہ جب یہ حضرت علیؓ اور اہل بیتؓ کے مناقب لکھ کر فارغ ہو گئے تو انہوں نے چاہا کہ ان کو دمشق کی جامع مسجد میں پڑھ کر سنائیں؛ تاکہ بنو امیہ کی سلطنت کے اثر سے عوام میں ناصبیت کی طرف جو رجحان پیدا ہو گیا تھا اس کی اصلاح ہو جائے، ابھی اس کا تھوڑا سا ہی حصہ پڑھنے پائے تھے کہ ایک شخص نے پوچھا: امیرِ معاویہؓ کے فضائل کے متعلق بھی آپ نے کچھ لکھا ہے؟ امام نسائیؒ نے جواب دیا: اگر وہ برابر سرابر چھوٹ جائیں تو بسا غنیمت ہے، مناقب تو ان کے کہاں ہیں، پھر کیا تھا!! لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور شیعہ شیعہ کہہ کر مارنا پیٹنا شروع کیا، ان کی خصیتین میں چند شدید ضربیں ایسی پہنچیں کہ نیم جان ہو گئے، خادم ان کو اٹھا کر گھر لے آئے، آپ نے فرمایا مجھے ابھی مکہ مکرمہ پہنچاؤ؛ تاکہ میرا آخری وقت وہیں ہو، کہتے ہیں کہ

جب امام نسائیؒ مکۂ مکرمہ پہنچے تو آپ کا انتقال ہوگیا، اور صفا و مروہ کے درمیان دفن کیے گئے، ۱۳/ صفر ۳۰۳ھ میں پیر کے دن آپ کا انتقال ہوا، بعض کا قول یہ بھی ہے کہ مکۂ مکرمہ جاتے ہوئے راستہ میں بمقام شہرِ رملہ (فلسطین) انتقال ہوا، پھر وہاں سے آپ کی نعش مکۂ معظّمہ پہنچائی گئی۔ واللہ اعلم۔

(۱۱) تذکرۂ امام ابن ماجہ (۱)

آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

ابوعبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ ابن ماجہ قزوینی الربعی۔

ربعی ولاء کی طرف نسبت ہے، ابن خلکان بیان کرتے ہیں کہ ربیعہ عرب کے متعدد قبیلوں کا نام ہے، معلوم نہیں کہ ان بزرگ کی نسبت اس میں سے کس کی طرف ہے، قزوین عراقِ عجم کا مشہور شہر ہے۔

ابن ماجہؒ نے بہت سی نافع اور مفید کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، ان میں سے ایک ''سننِ ابنِ ماجہ'' بھی ہے، جس کا صحاحِ ستہ میں شمار ہے، وہ جب اس کی تالیف سے فارغ ہوئے تو اس کو ابوزرعہ رازیؒ کے پاس پیش کیا، انہوں نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تو (حدیث کی موجودہ) تصنیفات یا ان میں سے اکثر معطّل ہوکر رہ جائیں گی، فی الحقیقت احادیث کو بلا تکرار بیان کرنے اور حسنِ ترتیب واختصار کے لحاظ سے کوئی کتاب اس کے ہمسر نہیں ہے۔ حافظ ابوزرعہؒ نے بھی اس کی

(۱) امام ابن ماجہ قزوینیؒ کے ترجمہ کے لیے دیکھیے: [سیر اعلام النبلاء ۱۳: ۲۷۷۔ تھذیب الکمال ۲۷: ۴۰۔ تذکرۃ الحفاظ ۲: ۶۳۶۔ الکاشف: ۳۔ الترجمۃ ۵۳۱۳۔ تھذیب التھذیب ۹: ۵۳۰ و ۵۳۲، ج ۹۔ بحوالہ منحات التنقیح ۱: ۸۶۔ بستان المحدثین اردو، ص ۱۹۰]

صحت پر گواہی دی ہے، انہوں نے فرمایا ہے کہ میرا ظنِ غالب یہ ہے کہ اس کتاب میں ایسی حدیثیں جن کی سندوں میں کچھ خلل ہے یا وہ متہم یا شدید النکارۃ ہیں تیس سے زیادہ نہ ہوں گی، اس سنن میں بتیس [۳۲] کتابیں ہیں، ایک ہزار پانچ سو ابواب اور کل چار ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔

صحیح یہی ہے کہ ماجہ (جیم کی تخفیف) آپ کی والدہ کا نام ہے، ابن میں الف لکھنا چاہئے؛ تا کہ معلوم ہو جائے کہ ابن ماجہ محمد کی صفت ہے نہ کہ عبداللہ کی۔

ان کی تصانیف میں سے قرآن کی تفسیر اور "کتاب التاریخ" ہے۔

ابن ماجہ ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے، ان کو عراق، بصرہ، کوفہ، بغداد، مکہ، مدینہ، شام، مصر، واسط، رے، اور دوسرے اسلامی شہروں میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا، حدیث کے تمام علوم سے واقفیت اور شناسائی رکھتے تھے، جبارہ بن المغلسؒ، ابراہیم بن المنذرؒ، ابن نمیرؒ، ہشام بن عمارؒ اور اسی طبقہ کے دوسرے بزرگوں سے علمِ حدیث حاصل کیا، ابوبکر ابن ابی شیبہؒ سے زیادہ تر استفادہ کیا، ۲۲/ رمضان المبارک ۲۷۳ھ میں دوشنبہ کے روز امام ابن ماجہؒ کا انتقال ہوا، اور سہ شنبہ کے دن دفن ہوئے۔

(۱۲) تذکرۂ امام دارمی[۱۰۵]

آپ کا نام ونسب یہ ہے:

---

[۱۰۵] امام دارمیؒ کے ترجمے کے لیے دیکھیے: [تاریخ بغداد: ۱۰/ ۲۹، ۳۲۔ انساب السمعانی: ۵/ ۲۵۲۔ الکامل فی التاریخ: ۷/ ۲۱۷۔ تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۵۳۴۔ سیر اعلام النبلاء: ۱۲/ ۲۲۴۔ تہذیب الکمال: ۱۵/ ۲۱۰۔ ثقات ابنِ حبان: ۸/ ۳۶۴۔ تہذیب التہذیب: ۵/ ۲۹۴، ۲۹۶۔ بحوالہ نفحات التنقیح: ۱/ ۸۸۔ بستان المحدثین' اردو، ص ۷۴]

ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمن بن الفضل بن بہرام بن عبدالصمد تمیمی، دارمی، سمرقندی، جس سال عبداللہ بن مبارکؒ کی وفات ہوئی اسی سال دارمیؒ کی ولادت ہے، یعنی سنہ ۱۸۱ھ میں۔

دیانت، علم، اجتہاد، اور عبادت میں ضرب المثل تھے، حدیث کی تلاش میں بلادِ اسلامیہ کے دور دراز کے اسفار کیے، دارمیؒ اپنے زمانہ کے امام تھے، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام ابوداودؒ، اور امام احمد بن حنبلؒ کے فرزند عبداللہؒ جیسے ائمۂ حدیث آپ کے تلامذہ کی فہرست میں شامل ہیں۔ حافظ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ امام نسائیؒ نے بھی ''سننِ صغریٰ'' کے علاوہ ان سے روایت کی ہے، امام احمدؒ کے فرزند اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ خراسان میں چار شخص حافظِ حدیث ہیں: (۱) ابوزرعہ رازیؒ (۲) محمد بن اسماعیل بخاریؒ (۳) عبداللہ بن عبدالرحمن دارمیؒ (۴) حسن بن شجاع بلخیؒ۔

''مسندِ دارمی'' آپ کی مشہور تصنیف ہے، اس کو مسند کہنا محدثین کی اصطلاح کے خلاف ہے، اس کتاب میں ثلاثیات تمام کتابوں سے زیادہ ہیں، کتاب ۳۵۵۷ حدیثوں پر مشتمل ہے[۱۹۰]۔

یوم پنجشنبہ (عرفہ) سنہ ۲۵۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی، اور عیدالاضحیٰ یومِ جمعہ کو مدفون ہوئے، امام بخاریؒ کو جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو انتہائی صدمہ سے سر جھکالیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور بے ساختہ آپ کی زبان سے یہ حسرت آمیز شعر نکل گیا، حالانکہ بجز ان اشعار کے جو احادیث میں روایت

---

[۱۹۰] احادیث میں سب سے اعلی اور اقرب اسانید ''ثلاثیات'' شمار ہوتی ہیں، ایسی رایات ''مسند دارمی'' میں پندرہ (۱۵) تک مروی ہیں [مقدمۂ اشعۃ اللمعات: ۱/ ۲۰۔ نفحات التنقیح: ۱/ ۸۸]

کیے گئے ہیں آپ کبھی کوئی شعر نہیں پڑھتے تھے۔

إِنْ تَبْقَ تُفْجَعْ بِالْأَحِبَّةِ كُلِّهِمْ وَفَنَاءُ نَفْسِكَ۔ لَا أَبَالَكَ۔ أَوْجَعْ [191]

اگر تو زندہ رہا تو تمام دوستوں کی مفارقت کا درد تجھ کو سہنا پڑے گا؛ مگر تیری موت کا سانحہ ان سب سے دردناک ہے۔

(۱۳) تذکرۂ امام دارقطنی [192]

آپ کا نام ونسب یہ ہے:

علی بن احمد بن مہدی بن مسعود بن نعمان بن دینار بن عبداللہ۔

آپ کی کنیت ابوالحسن ہے، شافعی المذہب تھے، دارِقطن بغداد میں ایک بڑا محلہ ہے، وہیں آپ رہتے تھے۔ آپ ۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے، طلبِ حدیث کے لیے آپ نے کوفہ، بصرہ، شام، واسط، مصر اور بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے۔

حاکم عبدالغنی منذری صاحبِ ترغیب وترہیب، تمّام رازی صاحبِ فوائد مشہورہ، اور ابونعیم صاحبِ حلیہ جیسے ائمۂ حدیث آپ کے زمرۂ تلامذہ میں شامل تھے، فنِ علل واسماء الرجال میں استاد مانے جاتے تھے، اور اپنی نظیر نہ رکھتے تھے، خطیب، حاکم وغیرہ کو آپ کے تفوّق کا اعتراف تھا، فنونِ حدیث کے علاوہ فنِ قراءت وتجوید میں بھی آپ کو کافی دستگاہ تھی۔

قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اپنے زمانۂ شباب میں اسماعیلی صفّار کی مجلس

---

(۱۹۱) [مقدمہ سنن دارمی، ص:۶]

(۱۹۲) امام دارقطنیؒ کے ترجمہ کے لیے دیکھیے: [وفیات الاعیان: ۳/ ۲۹۷۔ سیر اعلام النبلاء: ۱۶/ ۴۵۱۔ بستان المحدثین اردو، ص ۷۵]

میں املا میں بیٹھے ہوئے کچھ تحریر فرمارہے تھے، حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ اس طرح تو تمہارا اسماع معتبر نہیں ہوسکتا، ایک طرف لکھنے میں مشغول ہو اور دوسری طرف حدیث بھی سن رہے ہو۔ دارِ قطنیؒ نے کہا: اچھا! جناب کو یاد ہے کہ اب تک شیخ نے کتنی حدیثیں املا کرائی ہیں، انہوں نے کہا: نہیں، دارِ قطنیؒ نے فرمایا: اٹھارہ حدیثیں، پھر ان تمام حدیثوں کو بالترتیب حفظ سنا دیا، یہ دیکھ کر اہلِ مجلس حیران رہ گئے۔

ابوالحسن بیضاویؒ ایک شخص کو اپنے ہمراہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یہ شخص بڑی دور دراز سے علمِ حدیث طلب کرنے کے لیے آیا ہے برائے مہربانی چند حدیثیں اس کو بھی املا کرادیجیے، دارِ قطنیؒ نے لطائف الحیل سے ٹالنے کے لیے یہ جواب دیا کہ مجھ کو فرصت نہیں، جب ابوالحسن بیضاویؒ نے بہت اصرار کیا تو اس کو بیس سندیں ایسی لکھوائیں جن کا متن یہ تھا: **نعم الشئی الھدیة امام الحاجة** دوسرے دن وہ مردِ غریب کوئی مناسب ہدیہ لے کر حاضر ہوا تو اس کو سترہ سندیں لکھوائیں اور ان سب کا متن یہ تھا: **اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ**۔

آپ کی علمی ظرافتوں سے ایک واقعہ یہ بھی مشہور ہے کہ ایک دن آپ نماز میں مشغول تھے اور کوئی شخص غلطی سے نُسَیر کو بشیر پڑھ رہا تھا، دارِ قطنیؒ نے سبحان اللہ کہا؛ تاکہ وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوجائے؛ مگر وہ نہ ہوا، اور اب کی بار یُسیر (یاء کے ساتھ) پڑھنے لگا، جب آپ نے دیکھا کہ یہ کسی طرح اصلاح پر نہیں آتا تو آپ نے بلند آواز نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ پڑھنا شروع

کردیا؛ تاکہ وہ سمجھ جائے کہ اس راوی کا نام نون کے ساتھ ہے۔ (نماز میں اس طرح تلقین کرنا شوافع کے یہاں جائز ہے؛ مگر احناف کے نزدیک درست نہیں)

اسی طرح ایک شخص عمرو بن شعیب کو عمرو بن سعید پڑھ رہا تھا، یہاں بھی آپ نے سبحان اللہ؛ کہا جب وہ ادا کرنے میں اٹکنے لگا تو آپ نے یہ آیت تلاوت کی يَاشُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ۔

آپ کی وفات ۸ / ذیقعدہ ۳۸۵ھ میں جمعرات کے روز ہوئی، حافظ ابو نصر بن مالا کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں فرشتوں سے دارِ قطنی کا حال پوچھ رہا ہوں، انہوں نے مجھے یہ جواب دیا کہ جنت میں ان کا لقب امام ہے، مقبرۂ باب حرب میں معروف کرخیؒ کے پاس آپ کا مزار مبارک بنا ہوا ہے۔

(۱۴) تذکرۂ امام بیہقیؒ [۱۰۳]

آپ کی کنیت ابوبکر ہے، اور نام ونسب یہ ہے:
احمد بن الحسین بن علی بن عبداللہ بن موسیٰ بیہقی۔

بیہقی کی نسبت بیہق کی طرف ہے اور بیہق چند گاؤں کا نام ہے جو باہم

---

(۱۰۳) امام بیہقیؒ کے ترجمہ کے لیے دیکھیے: [الانساب للسمعانی: ۲/ ۳۸۱۔ الکامل لابن اثیر: ۱۰/ ۵۲۔ وفیات الاعیان: ۱/ ۷۵، ۷۶۔ تذکرۃ الحفاظ: ۲/ ۱۱۳۲۔ سیر اعلام النبلاء: ۱۸/ ۱۶۳۔ کشف الظنون: ۱/ ۹، ۵۳، ۱۷۵۔ طبقات السبکی: ۴/ ۱۶۰۸۔ بحوالۂ نفحات التنقیح: ۱/ ۹۲۔ "بستان المحدثین" اردو، ص ۸۳]

متصل اور نیشاپور سے تیس کوس کے فاصلہ پر واقع ہیں، اور یہ ایسا ہے جیسے نواحِ دہلی میں بارہہ اور ہریانہ، ان دیہات میں سب سے بڑا گاؤں خُسرَ وجِرد ہے (جیم کے کسرہ کے ساتھ) جہاں بیہقیؒ کی قبر ہے۔ ماہ شعبان المعظم ۳۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ حاکم ابو طاہر بن فورک متکلم اصولی، ابو علی رودباری صوفی، اور ابو عبد الرحمن سلمی صوفی سے علم حاصل کیا، اور بغداد، خراسان، کوفہ، حجاز، اور دیگر بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے علم میں بڑی برکت اور فہم میں کامل قوت عطا فرمائی تھی۔ ان کی یادگار میں ایسی ایسی تصانیف موجود ہیں جو ان سے پہلے لوگوں سے ظاہر نہیں ہوئیں۔ بہت کثیر التصانیف محدث تھے، ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد ایک ہزار تک شمار کی گئیں ہے۔

ان کے قلم سے ایسی ایسی تصانیف نکلی ہیں جن کی نظیر سابقین میں بھی خال خال ملتی ہے، ان کی چیدہ اور نافع تصانیف میں سے "کتاب الأسماء والصفات" ہے یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، سبکیؒ کہتے ہیں: مجھے اس کتاب کی نظیر نہیں ملتی، اس طرح دلائل النبوۃ، مناقب الشافعی، دعوات الکبیر، شعب الایمان۔

سبکیؒ کہتے ہیں: میں قسم کھا کر بیان کرسکتا ہوں کہ دنیا میں یہ پانچوں کتابیں بے مثل ہیں، اس کے علاوہ سننِ کبریٰ، خلافیات، کتاب الزہد [۴۰]، اربعین صغریٰ

[۴۰] کتاب "الزھد الکبیر" پر تحقیق وتعلیق کا کام حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ العالی نے کیا ہے۔ یہ مولانا کے جامع ازہر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے رسالہ کا موضوع رہا ہے، اس کی تحقیق پر انہوں نے ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کی ہے، کتاب پر حضرت مولانا ابو الحسن علی ندویؒ اور دیگر اہلِ علم کے مقدمے ہیں، اس کا پانچواں ایڈیشن دار الفتح بیروت نے شائع کیا ہے۔ [مجلہ: الشارق، مظفر پور، محرم، صفر ۱۴۳۷ھ]

وکبریٰ، کتاب الاسرار، بھی ان کی تصانیف میں بلند پایہ کتابیں ہیں۔

زہدوورع میں وہی خصائل رکھتے تھے جو علمائے ربانیین میں ہونی چاہئیں۔ امام الحرمینؒ فرماتے تھے کہ ہر شافعی مذہب والے پر امام شافعیؒ کا احسان ہے؛ لیکن ایک بیہقی ہیں جن کا احسان خود امام شافعیؒ پر ہے، کیونکہ ان کی فقہ کو اس طرح مضبوط ومدلّل طور پر مدوّن کرنے اور اس کے رائج کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔

''معرفۃ السنن والآثار'' کی تصنیف کے دوران متعدد اشخاص نے امام شافعیؒ کو خواب میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں اس کتاب کے چند اجزا ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ آج فقیہ احمد کی کتاب کے سات اجزا ہم نے پڑھے ہیں، ان تمام فضائل وکمالات کے باوجود یہ تعجبات میں سے ہے کہ جامع ترمذی، نسائی، اور سنن ابن ماجہ، ان کے پاس نہ تھیں، اس لیے ان ہر سہ کتابوں کی احادیث کی انہیں کما ینبغی اطلاع نہ تھی۔

محمد بن عبد العزیز مروزیؒ- جو مشہور فقیہ ہیں- فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک صندوق آسمان سے زمین کی طرف اڑا جارہا ہے اور اس کے ارد گرد ایک ایسا چمکتا ہوا نور ہے جو آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے، میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا چیز ہے تو فرشتوں نے جواب دیا کہ امام بیہقیؒ کی تصنیفات کا یہ صندوق ہے جو بارگاہِ کبریا میں مقبول ہوگیا ہے۔

۱۰/ جمادی الاولی ۴۵۸ھ کو شہر نیشاپور میں ان کا انتقال ہوا، پھر ان کا تابوت بیہق کے سب سے بڑے شہر خسروجرد لایا گیا اور یہیں آپ کو ہمیشہ کے

لیے سپردِ خاک کردیا گیا[195]۔

(۱۵) تذکرۂ امام رزینؒ[196]

آپ کی کنیت ابوالحسن، اور نام رزین بن معاویہ بن عمار عبدری اندلسی سرقسطی ہے، اور عبدری قریش کے مشہور قبیلہ عبدالدار کی طرف نسبت ہے۔

مشہور محدث ہیں، ''تجرید الصحاح'' نامی کتاب میں ''موطأ امام مالک'' اور صحاح ستہ کی احادیث کو جمع کیا ہے، علامہ ابن اثیر جزری نے اپنی کتاب ''جامع الاصول'' کی تالیف میں اسی پر اعتماد کیا ہے، ان کی ایک اور تالیف تاریخِ مکہ پر بھی ہے۔

---

(۱۹۵) امام بیہقیؒ کا میلان کبھی کبھی شعروشاعری کی طرف بھی ہوتا تھا، درج ذیل چند پُر حکمت بیت آپ ہی کے ہیں ۔

مَنِ اعْتَزَّ بِالْمَوْلٰی فَذٰکَ جَلِیْلٌ — وَمَنْ رَامَ عِزاً عَنْ سِوَاہُ ذَلِیْلٌ
جس شخص کو خدا نے عزت دی تو وہ بزرگ ہے — اور خدا کے سوا کسی دوسرے سے عزت کا طالب ہوا تو وہ ذلیل ہے

وَلَوْ اَنَّ نَفْسِیْ مُذْبَدَاھَا مَلِیْکُھَا — مَضٰی عُمْرُھَا فِیْ سَجْدَۃٍ لَقَلِیْلٌ
میرے نفس کی جب سے اس کو اس کے مالک نے پیدا کیا ہے — اگر تمام عمر سجدہ (عبادت) میں گذر جائے تو نہایت قلیل ہے

اُحِبُّ مُنَاجَاۃَ الْحَبِیْبِ بِاَوْجُہٍ — وَلٰکِنْ لِسَانُ الْمُذْنِبِیْنَ کَلِیْلٌ
میں اپنے حبیب کی مناجات کو عمدہ طریقہ سے پسند کرتا ہوں — لیکن گنہ گاروں کی زبان گونگی ہے۔

[بستان المحدثین، اردو، ص:۱۳۶]

(۱۹۶) امام رزینؒ کے ترجمہ کے لیے دیکھیے: [سیر اعلام النبلاء: ۲۰ / ۲۰۴ مقدمۂ جامع الاصول: ۱ / ۴۸۔ تذکرۃ الحفاظ: ۴ / ۱۲۸۱۔ کشف الظنون: ۱ / ۳۴۵۔ بحوالۂ نفحات التنقیح: ۱ / ۹۴]

ایک طویل زمانہ تک مکۂ مکرمہ میں مقیم رہے، اور وہیں وفات پائی، قیامِ مکہ کے دوران حافظ ابومکتوم عیسیٰ بن ابوذرؒ سے ''صحیح بخاری'' کی اور حافظ ابوعبداللہ حسینی طبریؒ سے ''صحیح مسلم'' کی سماعت فرمائی، ان سے حدیث حاصل کرنے والوں میں قاضیٔ حرم ابوالمظفر محمد بن علی طبریؒ، حافظ ابوموسیٰ مدینیؒ، اور حافظ ابن عساکرؒ ہیں۔

صاحب ''بغیۃ الملتمس'' نے آپ کی وفات ۵۲۴ھ میں، اور تقی الدین الفاسی نے ۵۲۵ھ میں بتلائی ہے؛ لیکن حافظ ذہبیؒ نے ''سیر اعلام النبلاء'' اور ''العبر'' میں ۵۳۵ھ لکھی ہے۔

ساتواں باب

فوائدِ اسناد
و
طالبین سے گزارش

فوائدِ اسناد (۱۰)

اس زمانہ میں جب کہ حدیثوں کی کتابیں مرتب ہوچکیں، حدیثوں کو مع السند بیان کرنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی؛ لیکن باوجود اس کے علما نے اس سلسلۂ سند کو مستحسن سمجھا، اور اس کے چند فوائد تحریر فرمائے:

[۱]: اس سلسلۂ سند سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتصال اور وابستگی حاصل ہوجاتی ہے۔

[۲]: یہ سلسلۂ سند جاری رہتا ہے جو امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا طرۂ امتیاز ہے، اور یہ اسلام کے علاوہ کسی اور دین میں نہیں پایا جاتا، خواہ وہ ادیان سماوی ہوں یا غیر سماوی، بخلاف امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کہ ان کے یہاں رسول

---

(۱۰) علمِ حدیث میں سند کی اہمیت مخفی نہیں، عبداللہ بن مبارکؒ کا ارشاد ہے: ''الإسناد من الدین، ولو لا الإسناد لقال من شاء ما شاء'' اسناد دین میں سے ہے، اگر اسناد نہ ہوتی تو جس کا جو جی چاہتا کہتا۔ ان کا یہ بھی فرمان ہے: ''بیننا و بین القوم القوائم یعنی الإسناد'' اسناد ہمارے اور لوگوں کے درمیان ''پائے'' ہیں، یعنی احادیث ہم نے خود آپ اسے نہیں سنی؛ بلکہ صحابہؓ سے سنی ہیں اور صحابہؓ کا دور ہم سے دور ہے، جس تک ہم واسطوں ہی سے پہنچ سکتے ہیں۔ خطیب بغدادیؒ نے ابن مبارکؒ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں: ''مثل الذی یطلب أمر دینه بلا إسناد کمثل الذي یرتقی السطح بلا سلّم'' اس شخص کی مثال جو دینی بات کو بغیر سند کے حاصل کرتا ہے اس شخص جیسی ہے جو چھت پر بغیر سیڑھی کے چڑھتا ہے۔ [مقدمۂ صحیح مسلم ص: ۱۲ باب بیان أن الإسناد من الدین، فیض المنعم ص: ۸۲]
سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں: ''الإسناد سلاح المؤمن فإذا لم یکن معه سلاح فبأی شيء یقاتل'' (اسناد مؤمن کا ہتھیار ہے تو بغیر ہتھیار کے کیسے قتال کرے گا) امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''مثل الذي یطلب الحدیث بلا إسناد کمثل حاطب لیل'' (بغیر سند کے طالب حدیث کی مثال ایسی ہے جیسے رات کو لکڑیاں چننے والا) (الأجوبة الفاضلة للأسئلة الکاملة ص ۴۴، بحوالۂ کشف الباری عما فی صحیح البخاری: ۱/ ۵۲]

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر بات سندوں کے ساتھ منقول ہے [۱۹۹]۔

[۳]: سلفِ صالحین اور علمائے محدثین کی اقتدا و پیروی حاصل ہو جاتی ہے۔

انہیں فوائد کے پیشِ نظر ختمِ کتبِ حدیث یا کتبِ درسیہ کے بعد مدارس میں سندیں بھی عطا کی جاتی ہیں، ورنہ دراصل قابلیت اور استعداد سند ہوا کرتی ہے، اور اگر قابلیت و استعداد مفقود ہے تو سند رسمی ہوا کرتی ہے، تبرکاً کچھ مفید ہو تو ہو؛ لیکن استعداد و قابلیت کے ساتھ سند ہو تو ''نور علی نور'' اور اس وقت سند ''کبریتِ احمر'' کا حکم رکھتی ہے۔

مشائخِ کرام اپنی اسانیدِ کتاب وہاں تک بیان کرتے تھے جہاں تک وہ معروف و مطبوع نہ ہو، ہمارے اکابر کے یہاں شاہ ولی اللہؒ تک سند بیان کرنے کا دستور ہے، آگے نہیں، کیونکہ اس سے آگے مطبوعہ ہے، خود شاہ صاحبؒ نے رسالہ ''الإرشاد إلی مهمات الاسناد'' میں اپنی سند بیان فرمائی ہے، اور اس میں اسانید کا جال بچھایا ہے۔ اسی طرح حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی اسانید ''الیانع الجنی في أسانید عبد الغنی'' کے نام سے عرب و عجم میں مشہور ہے [۲۰۰]۔

---

[۱۹۹] حافظ ابنِ حزمؒ تحریر فرماتے ہیں کہ پہلی امتوں میں سے کسی کو یہ توفیق میسر نہیں ہوئی کہ اپنے رسول کے کلمات صحیح صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کر سکے، یہ صرف اِس امت کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس کو اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کی صحت اور اتصال کے ساتھ توفیق بخش دی گئی، آج روئے زمین پر کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو اپنے پیشوا کے ایک کلمہ کی سند بھی صحیح طریقہ سے پیش کر سکے، اس کے برخلاف اسلام ہے کہ جو اپنے رسول کی سیرت کا ایک ایک شوشہ بھی پوری صحت اور اتصال کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔ [ترجمان السنہ: ۱/ ۱۷۱]

[۲۰۰] ہندو پاک و بنگلہ دیش میں جو سند کا سلسلہ ہے اس کے مدار الاسناد حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ ہیں، انہوں نے اپنا ''ثَبَت'' لکھا، جس کا نام ''الیانع الجنی'' ہے۔

اپنی سندِ مشکوۃ

میں اپنی بے بضاعتی اور عدمِ استعداد کا اعتراف کرتے ہوئے سندِ مشکوۃ کو تبرکاً تحریر کرتا ہوں:

[۱]: میں نے ''مشکوۃ شریف'' حضرت مولانا ابوالشفاء حبیب الرحمن صاحب بلیاوی مدظلہم (۱۹۰) (مدرسِ دارالعلوم اشرفیہ راندیر، سورت) سے پڑھی،

⊂ ''ثَبَت'' کہتے ہیں اس تحریر کو جس میں کوئی شخص اپنی سند؛ مؤلفینِ کتبِ حدیث تک بیان کرے۔
''ثَبَت'': بالثاء المثلثة والباء الموحدة والتاء، ''ثَبَت'': بفتح الثاء وبفتح الباء، بفتحتین۔ اس کو بعض لوگ ''ثَبْت'' بھی پڑھ لیتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے۔
حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے ''ثَبَت'' کا نام ہے: ''اليانع الجني''۔
''یانع'' کا معنیٰ ہے پکا ہوا پھل، اور ''جنی'' کا معنیٰ ہے توڑا ہوا، یعنی ''فعیل'' بمعنی ''مفعول'' ہے، ''جنَی یجنِی، جنی الثمر'' پھل کو توڑا، ''جنیٰ'' بمعنی توڑا {وهزي إليكِ... رطبا جنيا}، {وجنا الجنتين دان} تو ''اليانع الجنی'' کا معنیٰ ہوا: پکا ہوا پھل جو توڑا ہوا ہے، پکا ہوا پھل تمہیں توڑ کر دے دیا۔
لیکن شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے بعد جو حضرات آئے؛ چونکہ وہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے شاگرد تھے، جیسے: حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ وغیرہ، اس لیے اُن حضرات کی اسانید کے الگ ''أثبات'' موجود نہیں تھے۔
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک رسالہ ان حضرات کے ''أثبات'' (''ثبت'' کی جمع) پر لکھا، یہ ان کا اپنا ''ثَبَت'' ہے؛ لیکن اس میں ان سب بزرگوں کی اسانید آگئی ہیں، اس کا نام ہے: (''الازدياد السني على اليانع الجني'')۔
''الازدياد'' کا معنیٰ ہے: اضافہ، اور ''سَنی'' کا معنیٰ ہے: رفیع، بلند؛ چونکہ یہ ''اليانع الجني'' پر اضافہ تھا، اس لیے ''الازدياد'' نام رکھا، اس میں ہمارے سارے اکابرینِ دیوبند کی اسانید موجود ہیں۔
[انعام الباری: ۱/ ۵۶ ملخصاً]

(۱۹۰) حضرت مولانا حکیم ابوالشفاء حبیب الرحمن صدیقی صاحب بلیاویؒ (ولادت ۱۹۱۹ء وفات ۱۱/ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۸۵ء بروز بدھ) یہاں ان کے گرامی نامہ کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو انہوں نے اپنی مشکوۃ کی سند کے بارے میں حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کے نام تحریر فرمایا ہے: ⊂

انہوں نے حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ سے پڑھی، اور انہوں نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ سے پڑھی ہے۔

[۲]: اسی طرح استاذِ محترم مولانا ابوالشفا صاحبؒ نے دوبارہ ''مشکوۃ'' کی سماعت حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ (صاحب التعلیق الصبیح) سے بھی کی ہے، اور ان سے ان کو اجازت حاصل ہے، مولانا محمد ادریس صاحبؒ نے ''مشکوۃ'' حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے پڑھی ہے، انہوں نے حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ سے، اور انہوں نے استاد الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ سے، اور انہوں نے حضرت مولانا رشید الدین صاحب بخاری ثم دہلویؒ سے، اور انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے، اور انہوں نے حضرت اقدس شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے کتبِ احادیث پڑھیں۔

⊂ ''عرض یہ ہے کہ احقر نے مشکوۃ شریف از اول تا آخر آپ کے اسی جامعہ (ڈابھیل) میں مولانا محمد بدرِ عالمؒ سے پڑھی، اور انہوں نے مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے سہارن پور میں۔ آگے ان کی سند کتب میں مشہور ہے۔

ثانیاً جب احقر دار العلوم دیوبند دوبارہ آیا تو ''التعلیق الصبیح'' کے مصنف اور میرے دیگر کتابوں کے استاذ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ جن کو اب چند ماہ سے رحمہ اللہ لکھا جا رہا ہے، ان سے اجازت لے کر شریکِ درس ہوا۔ خاصہ حصہ ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ میں دوبارہ سماعت کر رہا ہوں فرمایا کہ وقت ضائع نہ کریں اور میرے ہی پاس تفسیر کی کتابوں میں شریک ہو جائیں۔ بہر حال آپ کی فرمائش سے ظاہر کر دیا۔ پہلے اس کی بڑی وقعت ہوتی تھی اور جب سے جہالت عام ہے مخفی رکھا جاتا ہے۔ اللہ اس بیماری سے نجات عطا کریں۔ ویسے تمام کتب اور خاص کر کتبِ احادیث کی اجازت مخدومنا مولانا علامہ ابراہیم بلیاویؒ اور علامہ حضرت مولانا شیخ شبیر احمد عثمانیؒ، شیخ مدنیؒ اور مولانا محمد بدرِ عالم میرٹھیؒ سے حاصل ہے۔ ولا فخر فیہ اور اگر فخر کیا بھی جائے تو محمود ہے۔ اللہ عجب و غرور سے بچائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم و عمل میں ترقی نصیب فرمائیں۔ کچھ مقروض بھی ہو رہا ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھیں والسلام۔ احقر ابوالشفاء

[مقدمہ محمود الفتاویٰ ۱/ ۸۵،۸۴]

[۳]: حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو جملہ کتبِ حدیث کی اجازت مولانا عبد القیوم صاحب بڈھانویؒ سے بھی حاصل ہے، جو حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہونے کے علاوہ داماد بھی تھے، اور شاہ اسحٰق صاحبؒ کو شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے، اس طرح حضرت کا سلسلہ تینوں واسطوں سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ تک جاملا۔

[۴]: اسی طرح حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو شاہ عبد الغنی صاحبؒ سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے، ان کو اپنے والد شاہ ابو سعید صاحبؒ سے، اور ان کو شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے، اسی طرح شاہ عبد الغنی صاحبؒ کو شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ سے بھی اجازتِ حدیث ہے، اور ان کو حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے۔

[۵]: اسی طرح حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو شیخ احمد دحلان مفتیٔ شافعیہ بمکۃ المکرمۃ سے بھی روایت واجازتِ حدیث حاصل ہے۔

[۶]: اسی طرح حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو شیخ سید احمد برزنجی مفتی شافعیہ ببلدۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی روایت واجازت حدیث حاصل ہے۔

[۷]: اسی طرح استاذی حضرت مولانا ابو الشفا صاحبؒ کو حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے بھی روایت واجازتِ حدیث حاصل ہے۔

[۸]: نیز حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ (صاحب فتح الملہم) سے اجازتِ حدیث حاصل ہے۔

[۹]: نیز شیخ الاسلام سید حضرت اقدس مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سے بھی اجازتِ حدیث حاصل ہے، اور ان ہر سہ حضرات کو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ سے، اور ان کو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب

نانوتویؒ اور حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے، اور ان دونوں حضرات کو شیخ عبدالغنی محدث دہلویؒ سے اجازتِ حدیث حاصل ہے۔

[۱۰]: حضرت شیخ الہندؒ کو حضرت شاہ عبدالغنیؒ سے براہِ راست بھی اجازتِ حدیث حاصل ہے؛ نیز شیخ محمد مظہر صاحب نانوتویؒ اور شیخ احمد علی سہارنپوریؒ اور شیخ عبدالرحمن پانی پتیؒ سے بھی روایت و اجازتِ حدیث حاصل ہے، ان چاروں حضرات کو شاہ محمد اسحق صاحبؒ سے اور ان کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے، اور ان کو مسندِ ہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے۔

طالبین سے گزارش

علمِ حدیث کے شروع کرنے سے پہلے طلبۂ عزیز سے چند باتیں خصوصیت سے عرض کی جاتی ہیں:

[۱] اخلاص: ای جعل العمل خالصاً ملاوٹ اور آمیزش سے پاک کرنا۔ عمل، علمِ حدیث کا حصول ہے، اور اس کو جن چیزوں سے خالص کرنا ہے وہ ہر زمانہ میں متفاوت ہیں، جیسے جس زمانہ میں اسلامی حکومتیں تھیں، لوگ علم کو حکومت کے عہدوں کو حاصل کرنے کے لیے حاصل کرتے تھے؛ لیکن اب وہ بات نہیں رہی، اس زمانہ میں طلبا کے لیے سب سے زیادہ ضرررساں چیز وہ لاشئی ہے، آج اس بے غرضی نے ہمارے طلبا کو ہلاک کر دیا ہے، گھر سے والد یا اقربا کے ہنکالنے سے یہ مدرسہ میں آ گئے، اور اپنی زندگی گزار رہے ہیں، اس کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ سال کے ختم پر اگر کوئی کتاب اچھی طرح سمجھ میں آئی ہے تو اس پر خوشی نہیں ہوتی، اور کسی کتاب میں کمزوری رہی تو نہ غم ہوتا

ہے، نہ اس کی تلافی کی کوشش، ایک شخص گھر سے نکلا اور اس نے اپنی منزل بھی مقرر کرلی کہ یہاں تک پہنچنا ہے، اب یہ شخص حصولِ منزل میں کوشش کرے گا؛ لیکن جو بس تفریح کے لیے نکلے اور منزل بھی مقرر نہیں تو وہ کوئی جد و جہد نہ کرے گا، اس لیے اگر سبق کی چھٹی کا علم ہو جائے تو ان کو کوئی افسوس نہیں ہوتا، بخلاف وظیفہ کی چھٹی کے اعلان سے رونے لگتے ہیں۔

اس میدان میں قدم رکھنے والے کی ابتدائی نیت تفقہ فی الدین ہے، اسلامی احکام کو جاننا، اس کو سمجھنا، اور اس کے ادلۂ اجمالیہ یا تفصیلیہ سے واقفیت حاصل کرنا ہے، یہ نیت ہوگی تو علم کے لیے ۲۵ سال بھی خرچ کرنا آسان ہے، ورنہ سند تو دو سال میں بھی حاصل کر سکتے ہو، اور غایۃ الغایات ابتغاء وجہ اللہ (خدا کی رضا کی طلب) ہے۔

[۲] احترام: ع

بے ادب محروم گشت از فضل رب   با ادب با نصیب بے ادب بے نصیب

اس میں تین چیزوں کا احترام کرنا ہے: ایک علم کا۔ دوسرا اسبابِ علم کا۔ تیسرا خود کا احترام۔

پہلا: علم ایک معنوی چیز ہے، جس درجہ کا علم ہو اسی درجہ کی عظمت اور اہمیت دل میں ہو، اور اس کا امتحان دوسری چیز کے ٹکراؤ کے وقت ہوتا ہے۔

دوسرا: اسبابِ علم میں تین چیزیں ہیں، ایک استاد، دوم کتاب، سوم درسگاہ، استاد کی محبت دل میں ہو، اور اس کے لیے دعا کا اہتمام ہو، اور اس کو تکلیف پہنچے ایسی تمام چیزوں سے دور رہے۔ کتاب چاہے کسی بھی فن کی ہو باوضو چھونے کا اہتمام ہو، ہمارے طلبا نے یہ اصول بنالیا ہے کہ کتاب میں ہر سفید جگہ پر اپنی

تحقیقات سے سیاہی کرنا، جلد توڑنا، کتاب کو پرچوں کی حفاظت کا طاق بنانا، یہ سب محرومی کے اسباب ہیں، اپنی ذاتی کتاب میں اتنی وسعت نکل سکتی ہے کہ متعلقاتِ درس کو حسین انداز سے بطور حاشیہ نقل کرلیا جاوے۔ اور جس طریقہ سے مسجد کا احترام کرتے ہیں ایسے ہی درسگاہ کا احترام کرنا، اس میں شور کرنے سے، گندگی کرنے سے، اس کو سونے کی جگہ بنانے سے احتراز کیا جاوے۔

[۳] استحضار: پڑھے ہوئے کو یاد رکھنا، اس کے لیے تین ذرائع ہیں، ایک: مطالعہ کرنا۔ دوم: دورانِ درس پورے طور پر توجہ کے ساتھ سمجھنے کی سعی کرنا۔ سوم: مذاکرہ۔

اس زمانہ میں مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ آنے والے سبق میں کن کن مسائل سے بحث ہوگی اس کا اجمالی طور پر تعین، دورانِ درس استاد کی تقریر پر پوری توجہ دی جاوے، جسمانی اور دل و دماغ دونوں طریقہ سے حاضری ہو، اور بات کو پورے طور پر سمجھنے کی سعی کرے، اور اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آسکی تو اولاً رفقائے درس سے پھر استاد سے مراجعت کرکے اس کو حل کرلیں، پھر ان تمام سمجھی ہوئی باتوں کا ساتھیوں کے سامنے تکرار کر جاوے، دورۂ حدیث کے سال میں طلبا کو اساتذہ کی تقاریر نوٹ کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے، پھر ان تقاریر میں سے خلاصہ کو ذہن میں محفوظ رکھنا چاہیے۔

[۴] اجتناب عن المعاصی: پیچھے جو احترام کا نمبر گذرا، اس میں ایک بات تھی خود کا احترام، ہر طالبِ علم کے ہمیشہ یہ پیشِ نظر ہونا چاہیے کہ میں علومِ نبوت کا طالب ہوں، میرے لیے کیا مناسب ہوگا اور کیا نامناسب ہوگا، اس لیے جس دین کو وہ حاصل کررہا ہے وہ اس دین کے جملہ فرائض، واجبات، سنن

کا پابند ہونا چاہیے، دو چیز ہیں: ایک گناہ کا ہونا، دوسرا گناہ کرنا، بشری تقاضہ سے گناہ ہو سکتے ہیں تو فوری اس پر توبہ ہو، اور گناہ بالقصد کرنا یہ طالبِ علم کی شان ہی نہیں ہے۔

ہمارے طلبہ میں عامتاً سینمابینی، ڈاڑھی کتروانا، نماز میں کوتاہی، بدنظری، مجلس بازی میں اوقات کی تضییع، لباس میں بے احتیاطی، اساتذہ اور منتظمینِ مدرسہ کی غیبت، یہ سب امراض عام ہیں۔

جان لو! علم ایک نور ہے، جس کو اللہ تعالی قلبِ سلیم میں ودیعت فرماتے ہیں، اور گناہوں سے اگر دل میں سیاہی ہوگی تو علم کا نور نہیں آسکتا، زمانۂ طالبِ علمی ابھرتی جوانی کا عامتاً زمانہ ہوتا ہے، اس میں قوتِ شہوانیہ کا غلبہ ہوتا ہے، اس لیے بعض اکابر کا جملہ مشہور ہے "جو اپنے ۱۷ سے ۲۷ سال تک کی عمر کی حفاظت کرتا ہے وہ ولی ہو کر دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

ہمارے حضرت مرشد سیّدی فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے زمانہ میں جس دن "بخاری شریف" شروع ہوتی اس دن طلبا کی ایک بہت بڑی تعداد حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواب میں زیارت سے بہرہ ور ہوتی۔

[۵] باوضو درس کا اہتمام: وضو ایک نور ہے اور علم بھی نور ہے اس لیے وضو کے ساتھ اہتمام کروگے تو علم میں نورانیت آئے گی، بہت سے نیک بخت حضرات اب بھی ہیں جنہوں نے سن شعور میں قدم رکھنے کے بعد کسی بھی دینی کتاب کو بلاوضو نہیں چھویا۔

[۶] دعا: علم خدا تعالیٰ کے خزانوں سے ملتا ہے، اس لیے باری تعالیٰ سے علم کی زیادتی مانگنے کا حکم ہوا، بلا طلب کے تو ماں بھی نہیں دیتی، ہمارے طلبہ اس معاملہ میں بہت پیچھے ہیں، اور میں تو یوں کہتا ہوں کہ جو علمِ نافع کی زیادتی کی دعا نہیں مانگتا اس کی علامت یہ ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانہ میں گھومتا پھرتا دوسرے امور میں مشغول نظر آوے گا، اور دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد علمی لائن میں نہیں آتا۔

انواع طلبہ

ہمارے طلبہ کی اس سلسلہ میں چار انواع ہیں:

(۱): تعلیم میں محنت کے ساتھ دعاؤں کا بھی اہتمام۔

(۲): محنت بھی نہیں، دعا بھی نہیں۔

(۳): محنت کرتے ہیں، دعا نہیں مانگتے۔

(۴): صرف دعا مانگتے ہیں محنت نہیں کرتے، ان کا حال ایسا ہے جیسا شادی کیے بغیر اولاد کی دعا کرنا، ساتھ میں دعا ایک مستقل عبادت ہے، دعا کی کثرت سے عبادت میں کثرت ہوتی ہے، اور عبادت کی کثرت رضائے الٰہی کی کثرت کا موجب ہے، اس لیے طالب علم کو متواضع بن کر ہمیشہ دعا کا اہتمام کرنا چاہیے۔

فائدہ

ہمارے طلبہ کو دورۂ حدیث کے سال میں جو کتابیں روایتاً پڑھائی جاتی ہیں، ان میں زیادہ توجہ نہیں دیتے، نصاب بنانے والے اکابرین بیوقوف نہیں

تھے، اس میں بہت سارے فوائد ہیں، سب سے بڑا فائدہ سرد [۱۹۱] ہے، اور تکرار سے اوقع فی النفس روایات ہوتی ہیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم بجاہ سید المرسلین ﷺ و علی الہ و علی أصحابه، و علی من تبعهم بإحسان إلی یوم الدین. آمین.

---

(۱۹۱) ''السَّرْدُ'' مصدر ہے، معنی ہے: لگاتار ہونا، مطلب یہ ہے کہ لگاتار اور مسلسل پڑھنے و سننے سے محفوظ واوقع فی النفس ہو جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب ''انفاس العارفین'' کے حوالے سے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے تحریر فرمایا ہے:

معلوم ہونا چاہیے کہ علمائے حرمین میں حدیث کے پڑھنے کے تین طریقے ہیں: ایک طریقہ کا نام سرد (رواروی) ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ استاذ یا پڑھنے والا کتاب کو پڑھتا چلا جائے اس طور پر کہ لغوی مباحث اور فقہی اختلافات یا اسماء الرجال وغیرہ کی باتوں سے تعرض نہ کرے۔

اور دوسرے طریقے کا نام بحث وحل کا طریقہ ہے، یعنی کسی حدیث کو پڑھنے کے بعد اس کے اجنبی اور نادر الفاظ یا کوئی ترکیبی دشواری ہو، اس پر یا ایسے اسما سند کے جو غیر معروف ہوں اور ان کا ذکر کم آتا ہو، اسی طرح ایسے اعتراضات جو کھلے کھلے طریقہ سے وارد ہوتے ہیں، یا جن مسائل کا اس حدیث شریف میں صراحتاً تذکرہ کیا گیا ہو، ان پر استاذ ٹھہرے اور متوسط طریقہ کی گفتگو ان پر کر کے ان کو حل کرے، اس کے بعد آگے بڑھتا چلا جائے۔

تیسرا طریقہ درس کا وہ ہے جس کا نام امعان وتعمق کا طریقہ ہو سکتا ہے کہ حدیث کے ہر ہر لفظ، اس کے سارے متعلقات مالہا وما علیہا پر بحث کی جائے اور خوب خوب بحث کی جائے، مثلاً جہاں کوئی ذرا اجنبی لفظ آ گیا، یا کوئی مشکل ترکیب سامنے آئی، اس کے حل میں شعرا کے کلام سے شہادت پیش کرنا شروع کر دے اور اس کے مماثل کلمات سے ان کے مواد اشتقاق اور استعمال کے مقامات کو واضح کیا جائے۔

اسی طرح رجال کے اسما جہاں جہاں آئیں ان پر بحث کرنا شروع کر دے، ان کے حالات، ان کی سیرت بیان کی جائے، اور جس مسئلہ کا اس حدیث میں صراحتاً ذکر آیا ہو، اس پر قیاس کر کے جو مسائلِ غیرِ منصوصہ پیدا ہوتے ہوں فقہ کی کتابوں کے ان مسائل کا تذکرہ کیا جائے، اسی طرح ذرا ذرا سی مناسبت اور حیلہ سے عجیب وغریب قصے بیان کیے جاویں۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت ۱/ ۳۴۷)

مصادر ومراجع

اشعة اللمعات	شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ
الأعلام للزركلي	خیر الدین بن محمود بن محمد الزرکلی متوفی ۱۳۹۶ھ
اعلام الحدیث	امام ابوسلیمان احمد بن الخطابی متوفی ۳۸۸ھ
إعلاء السنن	علامہ ظفر احمد عثمانی متوفی ۱۳۹۴ھ
الأنساب	ابوسعد عبدالکریم بن محمد بن منصور السمعانی متوفی ۵۶۲ھ
انعام الباری شرح صحیح بخاری	حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ
أوجز المسالک	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا متوفی ۱۴۰۲ھ
البداية والنهاية	عماد الدین اسماعیل بن عمر المعروف بابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ
بستان المحدثین	حضرت شاہ عبدالعزیز متوفی ۱۲۳۹ھ
تاریخ بغداد	حافظ احمد بن علی المعروف بالخطیب البغدادی متوفی ۴۶۳ھ
تدريب الراوي	حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ
تدوین حدیث	حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی ۱۳۷۵ھ

تذکرۂ مولانا محمد اسعد اللہ ایرانی	مرتب: مولانا احمد اللہ اود گانوی
توجیه النظر إلى أصول الأثر	علامہ طاہر بن صالح بن احمد الجزائری ۱۳۳۸ھ
تذكرة الحفاظ	حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی ۷۴۸ھ
ترجمان السنة	مولانا بدر عالم میرٹھی متوفی ۱۳۸۵ھ
التعليق الصبيح	مولانا محمد ادریس کاندھلوی متوفی ۱۳۹۴ھ
تقريب التهذيب	حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ
تقرير بخاری	حضرت مولانا محمد زکریا صاحب متوفی ۱۴۰۲ھ
تهذيب التهذيب	حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ
تهذيب الكمال	جمال الدین یوسف بن عبد الرحمن بن مزی متوفی ۷۴۲ھ
جامع بيان العلم وفضله	حافظ ابو عمر یوسف بن عبد البر مالکی متوفی ۴۶۳ھ
الجامع للترمذي	امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی متوفی ۲۷۹ھ
جزء قراءت خلف الإمام	محمد بن اسماعیل البخاری متوفی ۲۵۶ھ
حجیتِ حدیث	حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ

حلیۃ الأولیاء	حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ بن احمد اصفہانی متوفی ۴۳۰ سنہ ھ
خطبات حکیم الاسلام	حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ۱۴۰۳ سنہ ھ
خیر الأصول فی حدیث الرسول	حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری متوفی ۱۳۹۰ سنہ ھ
درسِ ترمذی	حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ
دوائے دل	ماہنامہ ترکیسر
الرسالة المستطرفة	علامہ محمد جعفر کتانی ۱۳۴۵ سنہ ھ
السنة ومكانها فی التشريع الإسلامی	الدکتور مصطفی السباعی متوفی ۱۹۶۴ سنہ ء
سننِ دارمی	امام ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمن الدارمی متوفی ۲۵۵ سنہ ھ
سننِ أبی داود	امام ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی متوفی ۲۷۵ سنہ ھ
سیرة المصطفی	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی متوفی ۱۳۹۴ سنہ ھ بمطابق ۱۹۷۴ سنہ ء
سیر أعلام النبلاء	ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی ۷۴۸ سنہ ھ

سیر الصحابة	حضرت مولانا شاہ معین الدین ندوی متوفی ۱۳۶۰ھ
شارق	دوماہی مجلہ مظفر پور یوپی
شرح الطیبی	امام شرف الدین حسین بن محمد بن عبداللہ الطیبی متوفی ۷۴۳ھ
شرح الکرمانی	علامہ شمس الدین محمد بن یوسف بن علی الکرمانی متوفی ۷۸۶ھ
صحیح البخاری	امام ابوعبداللہ بن اسماعیل البخاری متوفی ۲۵۶ھ
صحیح مسلم	امام مسلم بن الحجاج القشیری النیسابوری متوفی ۲۶۱ھ
صحیح ابن حبان	حافظ محمد بن حبان ابوحاتم ۵۴ھ
طحاوي	امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی متوفی ۳۲۱ھ
طبقاتِ ابنِ سعد	امام ابوعبداللہ محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ
طریق الھجرتین وباب السعادتین	ابن قیم الجوزیہ متوفی ۷۵۱ھ
عجالۂ نافعہ	حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی متوفی ۱۲۳۹ھ
علوم القرآن	حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ
عمدة القاری	امام بدرالدین ابومحمد محمود بن احمد العینی متوفی ۸۵۵ھ
فتح الباری	حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ
فوائدِ نافعہ برعجالۂ نافعہ	حضرت مولانا محمد عبدالحلیم چشتی
فیض الباری	امام العصر انور شاہ کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ

فیض القدیر	شیخ محمد عبد الرؤف المناوی ۱۰۳۱ھ
فیض المنعم مقدمۃ مسلم شریف	حضرت مولانا سعید احمد پالنپوری مدظلہ
الکامل في التاریخ	علامہ ابو الحسن عز الدین علی بن محمد ابن الاثیر الجزری متوفی ۶۲۰ھ
کشف الظنون	مصطفی بن عبد اللہ المعروف بکاتب چلپی متوفی ۱۰۶۷ھ
کشف الباری	شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ
مجالس حکیم الامت	مرتب: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب متوفی ۱۳۹۶ھ
مجموعۃ الفتاوی	علامہ عبد الحی لکھنوی متوفی ۱۳۰۴ھ
مرقاۃ	شیخ فضل امام بن محمد ارشد متوفی ۱۲۴۰ھ
المرقاۃ شرح مشکوۃ	علامہ نور الدین علی بن سلطان القاری متوفی ۱۰۱۴ھ
المستدرک	حافظ ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکم النیسا بوری متوفی ۴۰۵ھ
مشکوۃ المصابیح	ولی الدین خطیب محمد بن عبد اللہ متوفی ۷۴۱ھ
مظاہر حق	علامہ نواب محمد قطب الدین خان دہلوی ۱۲۸۹ھ
معجم البلدان	علامہ ابو عبد اللہ یاقوت حموی رومی متوفی ۶۲۶ھ

معین المنطق	حضرت مولانا محمود حسن اجمیری متوفی ۱۳۹۳ھ
مقام صحابہ	حضرت مولانا محمد شفیع ۱۳۹۶ھ
مقدمہ فتح الباری	حافظ احمد بن علی المعروف بابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ
مقدمہ لامع الدراری	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی متوفی ۱۴۰۲ھ
موطأ الامام محمد	امام محمد بن الحسن الشیبانی متوفی ۱۸۹ھ
نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر	حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ
نفحات التنقیح شرح مشکوۃ المصابیح	حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ
نقوشِ بزرگاں	عبد القیوم راجکوٹی سلمہ
ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت	حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی متوفی ۱۳۷۵ھ